Co

Int

اِنتخابِ سُخن

مؤلفہ

ڈاکٹر یوگ دھیان آہوجہ
ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

مؤلف و ناشر - ڈاکٹر یوگ دھیان آہوجہ - دوآبہ کالج - جالندھر

۱۹۵۲ سن عیسوی

دوسری بار

پنجاب نیشنل پریس جالندھر میں چھپی

فہرست

دیباچہ

انسان اپنے دل کے لطیف جذبات کو ظاہر کرنے کے لیئے مختلف ذرائع کا سہارا لیا کرتا ہے۔ کہیں کہیں فنِ تعمیر کے کمال دکھا کر اس نے اپنی محبت، اپنی فتوحات یا اپنے دُکھ سُکھ کے جذبات کو ہمیشگی دینے کی کوشش کی ہے۔ آگرہ کا روضہ تاج محل ایسی ہی لافانی یادگاروں میں سے ایک ہے۔ لیکن فنِ تعمیر میں انسان اپنے دلی جذبہ کے اظہار کے لیئے بہت بھاری بیرونی وسائل سامان عمارت وغیرہ کا محتاج ہے۔ اور پھر ایسی یادگار پر مقام کی پابندی ہے جس جگہ پر بن گئی بن گئی۔ اور کئی بار یوں بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ ایسی عظیم الشان عمارتوں کو زمانے کی دست برد نے صحیح وسالم

نہ چھوڑا۔

جذباتِ انسانی کے اظہار کا ایک ذریعہ بُت تراشی بھی ہے۔ یہ فن بیرونی سامان کا اس قدر محتاج نہیں جس قدر کہ فنِ تعمیر۔ اور اس میں فنِ تعمیر کے مقابلے میں جذبات کا اظہار زیادہ نمایاں بھی ہو سکتا ہے۔ اور واقعیّت سے قریب بھی۔ مہاتما بُدھ کی مورتیاں اُن کے اطمینانِ قلبی اور سکونِ رُوحانی کو ظاہر کرتی ہیں۔ پھر بھی سخت پتھر، انسانی دل کے نازک جذبات کی، ہر پہلو سے اور مکمل صورت میں ترجمانی کرنے کے ناقابل ہے۔ بُت سازی کے فن پر بھی کم و بیش ویسی ہی پابندیاں ہیں جیسی کہ فنِ تعمیر پہ۔

تعمیر اور بُت سازی کی نسبت فنِ تصویر بیرونی اسباب کی کم حاجت رکھتا ہے۔ مصوّر رنگ اور مُوقلم سے اپنے جذبات کے مطابق دیکھنے والوں کے لیئے ایک انتہائی پُراثر ماحول پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی جذبات کی نمائندگی پُورے کمال تک نہیں پہنچتی۔ اور پھر تصویر بھی نہ تو زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ اور نہ ہی وقت کی دستبُرد سے محفوظ۔

فنونِ لطیفہ میں موسیقی ایک مخصوص اور ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اور بہت ہی کم حد تک بیرونی دُنیا کی محتاج ہے۔ موسیقی کے وسیلہ سے ہم دِلی جذبات کے اتار چڑھاؤ کا لطیف اور پُر اثر طریقے سے اظہار کر سکتے ہیں۔ لیکن موسیقی کو مکمل معنوں میں پُر تاثیر بنانے کے لئے ہمیں شاعری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ موسیقی کے کورے الاپ سے ہی جن کے ساتھ شاعری کے الفاظ کی مدد نہ لی گئی ہو۔ سُننے والوں کو پورے اور اطمینان بخش کیف اور سرُور کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اور پھر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ کسی صاحب فن کی موسیقی صحیح اور مکمل معنوں میں اُس کے ساتھ ہی زندہ رہا کرتی ہے۔

شاعری کے مقابلے میں مندرجہ بالا تمام فنونِ لطیفہ خارجی اسباب کے محتاج ہیں اور جذباتِ انسانی کی مکمل نمائندگی کرنے میں اتنے کامیاب نہیں ہو سکتے جتنا کہ شعر۔ اور پھر وُہ شاعری کے مقابلے میں کم درجہ پا بھی ہیں۔

شاعری کا ملکہ انسان کے لئے فطرت کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ انسانی دِل و دماغ کی پاکیزہ طاقتوں نے آج تک

جو کچھ بھی تخلیق کی ہے شعر اس میں سب سے اہم ہے۔ شاعر کا دِل لطیف اور پاکیزہ احساسات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور اس کے تاثرات شعر کے وسیلے سے دوسروں کے دِلوں تک پہنچتے ہیں۔ شعر کے ذریعے سے شاعر دِلی جذبات کے ہر پہلو کو پوری طرح سے ادا کر سکتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ بیرونی وسائل سے بے نیاز ہے۔ ہندوستان میں ہمیں موجودہ وقتوں میں بھی اُس زمانے کا منظوم ادب دستیاب ہے۔ جبکہ ابھی تحریر نے رواج تک نہ پایا تھا۔ لوگوں کی زبان پر ہی پُشت ہا پُشت سے آنے والے شعر آج تک زندہ رہے ہیں۔

یہ مانتے ہوئے بھی کہ شِعر کی قطعی تعریف ناممکن ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر حقیقت میں وہ کلام موزوں ہے۔ جس کے پڑھنے اور سُننے سے ایک روحانی سرُور حاصل ہوا کرتا ہے۔ یہی "سرُور" شِعر کی جان ہے۔ اور اسی میں اس کے دوام کا راز پنہاں ہے۔ انسان فطرتاً اُسی چیز کو چاہتا ہے۔ جس سے اسے کچھ خوشی حاصل ہو۔ اُسی حصول سرُور،

کی کمی اور بیشی کی مناسبت سے ہی انسان کسی چیز کو نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ یا اس سے محبت کیا کرتا ہے۔ شاعر احساسات کی اُن بلندیوں پہ پہنچتا ہے۔ جہاں اس کے جذبات دُنیا کے جذبات ہوتے ہیں۔ اور اس کے غم و شادی میں دُنیا کے غم و شادی کا شریک ہوتا ہے جذبات کی ایسی بلندیوں پہ لکھے ہوئے شعر وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایک زبان یا قوم کی نہیں تمام دُنیا کی چیز ہُوا کرتے ہیں۔

ہندوستان میں شاعری کا مقام نہایت پاک اور متبرّک رہا ہے۔ اس سرزمین کو فخر ہے۔ کہ یہ آغاز سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ دُنیا نے آج تک ہندوستان کے ادب کو صفِ اوّل میں جگہ دی ہے۔ دید، سب سے عظیم اور قدیم علم الہامی اسی خاکِ پاک کا لازوال ورثہ ہے۔ دنیا کے علم و ادب میں سنسکرت ایک لافانی اور لاثانی مقام رکھتی ہے۔ پالی اور دیگر پراکرت زبانوں کے ادبی کارنامے مخصوص اور ممتاز اہمیت کے مالک ہیں۔ ہندی نے بے نظیر اور زندۂ جاوید شاہ پارے

دنیا کو پیش کیے ہیں۔ ہمارے مُلک نے زبان کی کئی تبدیلیاں مشاہدہ کیں۔ زبان اُردو کی پیدائش اور ترقّی ہندوستان کی تاریخِ زبان دانی کا ایک دلچسپ ورق ہے۔ جہاں باقی زبانوں میں ہندوستان نے بہترین ادب کی تخلیق کی ہے وہاں اُردو زبان میں بھی سرزمین ہند کے شعرا نے نادر اور بیش بہا جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اُردو کے گلستانِ سُخن کو اپنے دِل و دِماغ کی آبیاری سے سدا بہار پھُولوں سے آراستہ کیا ہے۔ شعر و سُخن کے اس سرمایہ کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اختصار کی غرض سے اگر ہم اُردو شاعری کو تین دَور میں تقسیم کریں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ آغاز کے دَور میں اُردو شاعری پر ہندی کا خوشگوار اثر برقرار تھا۔ اس دَور کی زبان اور تخیّل میں سادگی کی جھلک تھی۔ جذبات میں ویسا ہی بے ساختہ پن اور جوش تھا۔ جیسا کہ سرچشمہ کے قریب پانی کی رَوانی میں قدرتی طور پر ہُوا کرتا ہے۔ تصوّف کے رنگ نے اِسے اور بھی دلکشی بخشی تھی۔ اس دَور کے شعرا کی سعی سے اُردو میں ایک ادبی زبان بننے کی صلاحیت

پیدا ہوگئی۔

دورِ متوسط میں اردو شاعری ابتدائی دور کی سادگی سے دور چلی گئی۔ ظاہری صورت کو باطنی خوبیوں پر ترجیح دی جانے لگی۔ عام طور پر حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستانیں ہی اس دور کی شاعری کا سرمایہ رہیں۔ اس دور کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ زبان کو جِلا دی گئی۔ الفاظ اور محاوروں کی اصلاح اور درستی ہوئی۔ اس دور کے صاحبانِ فن کی کوششوں نے اردو کو اس طرح آراستہ اور پیراستہ کیا کہ وہ ایک مستقل ادبی زبان کی صورت میں اوجِ کمال تک پہنچی۔

متاخرین کے دور کے ساتھ اردو شاعری میں ایک انقلاب وقوع میں آیا اور نظم کے خاکے میں کئی نئے رنگ بھرے گئے۔ شعر و سخن کو سماج اور انسان کی روزمرہ زندگی کے زیادہ قریب لایا گیا۔ اسی دور میں حُبِّ وطن اور قوم کی محبت کے ترانے اونچے سُروں میں سُننے کو ملے۔ اور پھر اسی دور کے موجودہ حصہ میں شاعر اپنے ماحول سے

دست و گریباں ہے۔ آج کا شاعر مذہب، سیاسیات، سماج اور پرانی تہذیب الغرض تمام بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ شاعری کا موضوع فردِ واحد نہ ہو کر قوم ہے اور ملک۔ قدرت کے مناظر مستقل صورت میں موضوعِ سخن بنے ہیں مبالغہ آمیزی کو چھوڑ کر حقیقت نگاری اور واقعیت کا رجحان غالب ہے۔ مزدور و سرمایہ دار، ترقی پسندی، خمریات، شبابیات آج کے شاعر کے سامنے کتنے ہی نئے مسئلے ہیں۔ کتنی نئی منزلیں اور نئی راہیں۔ ابھی موجودہ شاعری کئی کروٹیں بدل رہی ہے۔ جن کے نتائج کے لئے ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہے۔

دوآبہ کالج جالندھر ۔ یوگ دھیان آہوجہ

اظہار سپاس

مالک کے شکریہ کے ساتھ یہ انتخاب اردو ادب کے شائقین اور طلبا کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مجموعہ میں فقط چند ایک صاحبان کمال کے جواہر پارے ہی، بہ صد احترام و شکریہ، زینت صفحات کئے جا رہے ہیں۔ اس انتخاب کی تدوین و ترتیب میں حضرات جوش ملیح آبادی، مخدوم، جوش ملسیانی، فراق گورکھپوری، عرش اور آزاد نے بہ کمال کرم فرمائی اپنا سرگرم تعاون دے کر مؤلف کو شرف ممنونیت بخشا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ارباب ِبست و کشاد نے اس انتخاب کو ایف۔اے اُردو کے لئے نصاب تعلیم مقرر کیا ہے۔ راقم الحروف ان کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔

مجھے اپنی فروگذاشتوں کا احساس ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سے اساتذہ کا کلام شامل نہیں کیا جا سکا۔ کچھ مجبوریوں کے باعث چند ایک ارباب سے اجازت بھی نہیں لی جا سکی۔ اُمید واثق ہے۔ کہ مؤلف کی معذرت کو قبول کیا جائیگا۔

مؤلف۔

کتاب کی اشاعت پر فرہنگ کی کمی کی طرف راقم کی توجہ دلائی گئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ فرہنگ کا اضافہ کیا جا رہا ہے
اس تالیف کو مفید بنانے کے لئے قارئین کرام کی ہر تجویز کا شکریہ سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

مؤلف

انتخابِ سخن

درد

آپ کا نام خواجہ میر تھا۔ اور درد تخلص۔ آپ کی ولادت ۱۱۳۳ھ میں دہلی کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ آپ مختلف مذہبی علوم اور تصوّف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ آپکو موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا

آپ خود دار اور آزادانہ طبیعت کے مالک تھے۔ صوفی تھے۔ کلام میں بھی تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ کا دیوان مختصر ہے۔ لیکن اسی کی بدولت اُردو شاعری میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔

آپ کی تصانیف میں اُردو اور فارسی کے دیوان کے علاوہ کچھ رسالے بھی ہیں

آپ کا انتقال دہلی میں ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔

انتخاب از کلام درد

غزلیات

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ فریاد آہ اور زاری!
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وُہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسی نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں!
کوئی دُوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تُو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
اِدھر تُو نے لیکن نہ دیکھا، نہ دیکھا

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب، کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
جفا سے غرض امتحان وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اے ہمصفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا
خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم
تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم
جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی
ساتھ اپنے دو چار ہو گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر
اپنے تئیں آپ رو گئے ہم
ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا
پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم
یاروں ہی سے درد ہے یہ چرچا
پھر کوئی نہیں ہے جو سو گئے ہم

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے رو برو کریں

نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
آہ! بس جی مت جلا تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اوس پر چلے
ایک بن دل ریش تھوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

شمع کی مانند ہم اِس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا و لے
ساتھ اپنے اَب اُسے لے کر چلے

جُوں شرر ہے ہستیٔ بے بُود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کِس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

مرا جی ہے جب تک تری جستجُو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگُو ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہُوں، وہ تند خُو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تیری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا
گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

غنیمت ہے یہ دید وا دیدِ یاراں
جہاں آنکھ مند گئی نہ میں ہوں نہ تو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی رُو برو ہے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے۔
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے۔ آن میں کچھ ہے

بے خبر تیغ یار رکھتے ہیں
باقی اس نیم جان میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

اور بھی چاہیئے سو کہئے اگر
دلِ نا مہربان میں کچھ ہے
دردؔ تو جو کرے ہے جی کا زیاں
فائدہ اِس زیان میں کچھ ہے

رُباعیات

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے رُوبرو دیکھا تھا
اُن باتوں کو اب جو غور کیجئے اے دردؔ
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

مُدّت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا
یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا
جُوں آئینہ کب تلک پریشاں نظری
اب مُوند لیئے آنکھ بس جہاں کو دیکھا

آرام نہ دن کو بیقراری کے سبب
نے رات کو چین آہ وزاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو اِن بلاؤں سے کبھی
یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

اے دردؔ یہ درد جی سے کھونا معلوم
جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

ہر بت کے لئے کب تئیں مرتے رہیئے
کب تک یہ کفر دل میں بھرتے رہیئے
اب دردؔ جو کچھ کہ زندگی باقی ہے
اللہ کو اپنے یاد کرتے رہیئے

اے دردؔ بہت کیا پرکھا ہم نے
دیکھا تو عجب جہاں کا لیکھا ہم نے

بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ
جب آنکھ کھُلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی
اے دردؔ کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کریگا اس کو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

میرؔ

آپ کا نام میر تقی تھا۔ میرؔ تخلص تھا۔ آپ اکبر آباد میں ۱۱۳۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد آپ نے دہلی کو اپنا وطن بنایا۔ دہلی کی بربادی کے بعد آپ لکھنؤ آ گئے۔ آپ کی ساری زندگی درد و غم کی ایک لمبی داستان رہی۔ اس رو سے اوروں کی جگ بیتی کے مقابلے میں میرؔ کا کلام ان کی آپ بیتی ہے۔ آپ کو اردو کا خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ اردو کے عظیم مرتبہ شعراء نے آپ کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کا کلام سادگی اور صراحت میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے اشعار مایوسی اور درد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اور جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔

متعدد مثنویوں اور دیگر تصانیف کے علاوہ اردو کے چھ دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔

انتخاب از کلامِ میر

غزلیات

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

نہیں ہے مرجعِ آدم اگر خاک
کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہیں
نہیں کم حشر سے اُودھم ہمارا

کسو کے بال برہم دیکھتے میرؔ
ہُوا ہے کامِ دل برہم ہمارا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا

ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

ہے قاعدۂ کلّی یہ کوئے محبت میں
دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابی میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا

آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

صد نشتر مژگاں کے لگنے سے نہ نکلا خوں
آگے تجھے میر ایسا سودا نہ ہوا ہوگا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں
تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں!
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رُقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

آرزو اُس بلند بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنّع کہ لعل ہیں وُہ لب
یعنی اِک بات سی بنائی ہے

دل سے نزدیک اور اِتنا دُور
کیسے اس کو کچھ آشنائی ہے

بے ستوں کیا ہے کوہ کن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہے

جس مرض میں کہ جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وُہ جُدائی ہے

یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وُہی ناز خود نمائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

قِطعات

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دِل
سارے عالم کو میں دِکھا لایا
دِل کہ اِک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دِل مجھے اُس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں مِلا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کیا بود و باش پُوچھو ہو پُورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پُکار کے

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

انشاؔ

آپ کا نام سید انشاء اللہ خان اور تخلص انشاؔ تھا۔ آپ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ عہد شباب میں دلی آ کر کچھ دیر شاہ عالم کے دربار سے وابستہ رہے۔ پھر وہاں سے آپ لکھنؤ آئے۔ یہاں آپ نے نواب سعادت علی خاں کے ہاں اپنی حاضر جوابی اور لطیفہ ظرافت کی بدولت بہت عروج و اقتدار حاصل کیا۔ لیکن اس شوخی اور بذلہ سنجی کے باعث ہی نواب موصوف کے عتاب کا شکار ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا آخری دور اندوہناک کیفیت میں گذرا۔

انشاء کی طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی اُن کے کلام میں عیاں ہے۔ کلیات کے علاوہ فارسی میں اردو قواعد پر لکھی ہوئی کتاب دریائے لطافت اور ٹھیٹ ہندی میں لکھی ہوئی "رانی کیتکی کی کہانی" آپ کی یادگار ہیں۔ آپ ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

غزلیات

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا
تو کیا بہک کے میں نے اُسے اِک سلام اُلٹا

یہ بلا دھواں نشہ ہے مجھے اس گھڑی تو ساقی
کہ نظر پڑے ہے سارا در و صحن و بام اُلٹا

بڑھوں اس گلی سے کیونکر کہ وہاں تو میرے دل کو
کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام اُلٹا

درِ میکدہ سے آئی مہک ایسی ہی مزے کی
کہ پچھاڑ کھا گرا واں دلِ تشنہ کام اُلٹا

فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اس نے انشاؔ یہ ترا ہی نام اُلٹا

جگر کی آگ بُجھے جس سے جلد وہ شئے لا
لگا کے برف میں ساقی صُراحیٔ مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل
خُدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اَے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اُس گُلِ رعنا کی دیکھیو اِنشاؔ
نسیمِ صُبح جو چھُو جائے رنگ ہو میلا

خیال کیجیٔے کیا آج کام میں نے کیا
جب اُس نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

کہا یہ صبر نے دِل سے کہ لو خُدا حافظ
کہ حقِ بندگی اپنا تمام میں نے کیا

جنوں یہ آپ کی دولت ہُوا نصیب مجھے
کہ ننگ و نام کو چھوڑا یہ نام میں نے کیا

جھڑک کے کہنے لگے لگ چلے بہت اب تم
کبھی جو بھول کے اُن سے کلام میں نے کیا

تمہارے واسطے تم اپنے دل میں غور کرو
کبھی کسی سے نہ ہو جو مدام میں نے کیا

مزا یہ دیکھئے گا شیخ جی رُکے اُلٹے
جو اُن کا بزم میں کل احترام میں نے کیا

ہوس یہ رہ گئی صاحب نے پر کبھی نہ کہا
کہ آج سے تجھے انشا غلام میں نے کیا

ہے یہ اس مہ جبین کی تصویر
یا کسی حورِ عین کی تصویر

بن گئی دودِ آہِ مجنوں میں
ایک محمل نشین کی تصویر

اپنے داغِ جگر میں سوجھی ہے
مجھ کو اس نازنین کی تصویر

دیکھ لے اُس کی چینِ پیشانی
ہے یہ خاقانِ چین کی تصویر

نظر آتی ہے اشکِ انشا میں
جبرئیلِ امین کی تصویر

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ! ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ابر کی آمد

لہرا دیا صبا نے جو کل سبزہ زار کو
وو ہیں گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو

جوش و خروشِ رعد نے یہ دھوم دھام کی
ہرگز کوئی کسی کی نہ پہنچا پکار سکو

بجلی تڑپ تڑپ کے دکھانے لگی چمک
رونق ہوئی دو چند ہر اک برگ و بار کو

کچھ لکہ ہائے ابر سپید و سیاہ و سرخ
مستانہ جھوم جھوم چلے کوہسار کو

ہم مشرب اپنے چند جواں تھے سو نہر پر
تشریف لے گئے وہ بطوں کے شکار کو

آتش

خواجہ حیدر علی آپ کا نام تھا۔ اور آتش تخلّص۔ آپ کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ لکھنؤ آئے۔ جہاں آپ نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ توکّل اور قناعت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی۔ آپ کے بہت سے شاگردوں نے اُردو شاعری میں کمال اور شہرت حاصل کی۔ آپ کے کلام میں روانی ہے۔ اور آپ کی جذبات نگاری کا انداز لطیف اور دلکش ہے۔ آپ اُردو غزل کے مستند اُستادوں میں سے ہیں۔ آپ کا ایک دیوان آپ کی زندگی میں ہی طبع ہُوا تھا۔ اور دُوسرا دیوان پہلے کے تتمہ کی صورت میں بعد میں شائع ہُوا۔ آپ کا سنِ وفات ۱۲۶۳ ہجری ہے +

انتخاب از کلامِ آتش

غزلیات

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بُت سے برہمن بگڑا

تیری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اُس کا چلن بگڑا

کمالِ دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی مارِ یاسمن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہُوا اپنا۔ نہ اک تارِ کفن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تک اُس محبوبِ عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس سرخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

بے یار سازوار نہ ہوگا وہ گوش کو
مطرب ہمیں سُناتا ہے اپنا ترانہ کیا

صیادِ گلعذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تُو نے کہی عاشقانہ کیا

تصوّر سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی رُوبرُو برسوں

برابر جان کے رکھا ہے اُس کو مرتے مرتے تک
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

ملی ہے ہم کو بھی خُمخانۂ افلاک میں راحت
سرہانے ہاتھ رکھ کر سوتے ہیں زیرِ سبُو برسوں

بسر کی مدت العمر اپنی سیر باغ و بستاں میں
سنگھائی گل نے اُس گل پیرہن کی ہم کو بو برسوں

دیا ہے حکم تب پیر مغاں نے سجدۂ خُم کا
کیا ہے جب شراب ناب سے ہم نے وضو برسوں

فنا ہو جائیگی جاں اپنی وہ نازک طبیعت ہوں
دکھا کر دل مرا پچھتائیگا وہ تند خو برسوں

اگر میں خاک بھی ہونگا تو آتش گرد باد آسا
رکھے گی مجھ کو سرگشتہ کسی کی جستجو برسوں

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گُل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشّہ میں جھومتے ہیں
مُریدانِ پیرِ مُغاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مِٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
کہ پھرتے ہیں خوش باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کئے ناتواں کیسے کیسے

دلِ و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

خدا پنہاں ہے عالم آشکارا
نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے

دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل
یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

جرس کے ساتھ دل رہتے ہیں نالاں
میرے یُوسف کا عاشق کارواں ہے

قدِ محبوب کو شاعر کہیں سرو
قیامت کا یہ اے آتِشؔ نشاں ہے

ذوق

آپ کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ اور ذوقؔ تخلص تھا۔ آپ کی ولادت دہلی میں ۱۲۰۴ھ میں ہوئی۔ آپ کو تھوڑے سے ہی وقت میں شعرگوئی میں پختگی حاصل ہو گئی تھی۔ آغاز میں آپ کچھ دیر شاہ نصیرؔ کے شاگرد رہے تھے۔ آپ بہادر شاہ ظفرؔ شاہ دہلی کے استاد بنے۔ اکبر شاہ سے آپ کو خاقانیٔ ہند کا خطاب ملا۔ اور بہادر شاہ ظفرؔ نے آپ کو ملک الشعرا بنایا۔
آپ غزل اور قصیدہ دونوں کے قادر الکلام استاد ہیں۔ غزل میں آپ نے زبان کو پاکیزگی دی ہے۔ زورِ تخیل اور علوِ بیان آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔
آپ کا کلام آپ کی وفات کے بعد مرتب کیا گیا۔
آپ نے ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔

غزلیات

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دینا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنّا نہیں آتا

کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینہ میں غم سے
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھئے آنا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمر جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل ٹوٹتا ہے تم نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشتِ گمشدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سُراغ سے دُور اور شکستہ پر

اُس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ کوہ و راغ سے دُور اور شکستہ پر

ساقی بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

خود اُڑ کے پہنچے نامہ جو ہو مرغِ نامہ بر
اُس شوخِ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کماندار تیرا تیر
پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوقؔ میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

مزا تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے
مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا تیرے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکہ بے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبُو سبُو کرتے

نہ رہتی یُوسفِ کنعاں کی گرمیٔ بازار
مقابلے میں جو ہم تجھ کو رُو برُو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمّم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمرِ گذشتہ کا ڈھونڈیئے گر ذوقؔ
تمام عمر گُذر جائے جستجُو کرتے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہم داں
پر مرے زخم نہیں ایسے کہ بھر جائینگے

پہنچیں گے رہ گذرِ یار تلک کیونکر ہم
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائینگے
آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم سے تر جائینگے
ہم نہیں وہ جو کریں خُون کا دعویٰ تجھ پر
بلکہ پُوچھے گا خدا بھی تو مکر جائینگے
ذوقؔ جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا
اُن کو میخانہ میں لے آؤ سنور جائینگے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
کم ہونگے اِس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یُونہیں جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

رُباعیات

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ کہ ہُوا۔ ہُوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہو گا. تیرے کرم سے ہو گا

اے ذوقؔ کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اِک دم نہ ترا صرفِ مناجات ہوا
جب تک تھا جواں تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا ۔ پیرِ خرابات ہوا

اس جہل کا ہے ذوقؔ ٹھکانا کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

دُنیا کے الم ذوقؔ اُٹھا جائیں گے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
جب آئے تھے ہم روتے ہوئے آئے تھے
اب جائیں گے اوروں کو رُلا جائیں گے

غالبؔ

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ۱۲۱۲؁ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے نجم الدّولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان پہلے اسدؔ کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں غالبؔ تخلّص کیا۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد آپ بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد ہوئے۔ شعر و شاعری کا مادہ فطری تھا اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے۔ آپ کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ تنقید نگاروں کی رائے میں اُردو غزل میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کی جذبات نگاری۔ فلسفیانہ رنگ۔ پروازِ تخیّل اور جدّتِ ادا اُردو میں لاجواب ہیں آپ کی خطوط نویسی میں مکالمہ کی سی چاشنی ملتی ہے۔ دیگر تصانیف کے علاوہ آپ کے خطوط کے مجموعے "اردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" اور اُردو اور فارسی کے دیوان آپ کی یادگار ہیں۔

آپ نے ۱۲۸۸؁ھ میں وفات پائی۔

غزلیات

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دِل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنّا یعنی
پھر وُہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دِل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یُوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

جَور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو!
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہُوں
کاش پُوچھو کہ مُدّعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجُود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمّید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

قطعہ

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا رُوئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

حالی

آپ کا نام خواجہ الطاف حسین تھا۔ حالی تخلص تھا۔ آپ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ دورانِ شباب میں ہی آپ دہلی آ گئے اور وہاں نواب مصطفیٰ خاں کے ہاں اتالیق کے طور پر کام کرنے لگے اُنہیں کی وساطت سے حالی مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ آپ دہلی میں اینگلو عربک سکول میں مدرس کے طور پر کام کرتے رہے۔ بعد میں لاہور میں تعلیم کے محکمہ میں مامور ہوئے۔ حیدر آباد کی ریاست سے آپ کے لئے وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا گیا۔ آپ اُردو نظم اور نثر دونو میں ایک اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اُردو میں نیچرل اور اخلاقی شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ آپ کے دیوان کے علاوہ مسدّس مدّ و جزرِ اسلام (مسدّسِ حالی) یادگارِ غالب، مقدّمہ شعر و شاعری، حیاتِ سعدی وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں آپ ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن پانی پت میں فوت ہوئے۔

انتخاب از کلامِ حالیؔ

غزلیات

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کا
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا

بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کئے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالیؔ
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب
کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل
خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب

بادشاہی ہے نفس کی تسخیر
ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب

جن کے معبود حور و غلماں ہیں
اُن کو زاہد خدا سے کیا مطلب

کام ہے مردمی سے انساں کی
زہد یا اتّقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ
ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفیِ شہر باصفا ہے اگر
ہو۔ ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں جو حالیؔ
اُن کو دُرد و صفا سے کیا مطلب

ہے یہ تکیہ تیری عطاؤں پر
وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں نا آشنا زمانہ سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
رہرو و باخبر رہو کہ گماں
رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم انہیں اداؤں پر
اُس کے کوچہ میں ہیں وہ بے پر و بال
اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر
نہیں مُنعم کو اُس کی بُوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالیؔ
کیجیے کس منہ سے ان خطاؤں پر

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں
کی نصیحت بُری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انسان و چشمِ نرگس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اِس میں
نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فرس
ہیچ ہیں جو ہُنر ہیں فارس میں
جس سے نفرت ہے اہلِ نعمت کو
وُہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور ۔ آدمی ۔ فرشتہ ۔ خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں
آج کل چرخ صلح جو ہے بہت
دیکھیے ہو بگاڑ کس کس میں
کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں!
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہے اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیئے جب نام اُس کا!
بہت وُسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لُوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اُس کی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے

یارانِ تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری بُجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

رباعیات

ہمّت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا
"مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمّت دشوار"

جس کو

زندگانی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دُنیائے دُنی کو نقشِ فانی سمجھو
رُودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے
بنتی نہیں زندگی بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

توحید

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کیلئے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کیلئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

ترکِ شعرِ عاشقانہ!

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

سُرُور

منشی درگا سہائے سُرُور جہان آباد کے رہنے والے تھے بسنہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے آپ کو شعر و سخن کا شوق تھا۔ آپ آزادانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اور شاعری ہی آپ کی زندگی کا مقصد رہا۔ عین عالم شباب میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ آپ اُردو شاعری میں طرزِ جدید کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ آپ کا کلام پُر درد اور پُر اثر ہے اور اس میں قومیت کے جذبات نمایاں ہیں۔ زبان سادہ اور شُستہ ہے۔ آپ نے اُردو شاعری میں ہندی الفاظ کو جگہ دی۔

آپ کے مجموعۂ کلام کی دو جلدیں خمخانۂ سُرُور اور جامِ سُرُور کے نام سے آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔

آپ نے ۱۹۱۰ سنہ میں اس دارِ فنا سے کوچ کیا۔

فضائے برشگال

اُٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار
چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار

سہی قدوں کا ہے جمگھٹ کنارِ آبِ رواں
کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار

ترانہ ریز ہے بُلبل شاخِ سرو پر قمری
کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سُندر نار

ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی
ہوا میں اُڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں انار

عجب نشاط ہے بادہ کشو چلو تو سہی
پیامِ عیش ہے لایا چمن میں ابرِ بہار

بیوہ

وہ دُکھیا ہوں نہیں دردِ نہاں کا رازداں کوئی
وہ بیکس ہوں نہیں سنتا ہے میری داستاں کوئی

بنایا ہے سراپا داغِ حسرت سوزِ حرماں نے
پنہائے آہ پھولوں کی نہ مجھ کو بدھیاں کوئی

تقاضا لذتِ ذوقِ خلش کا ہے شبِ غم میں
جگر میں آہ رکھ دے چیر کر نوکِ سناں کوئی

زمانہ ہو رہا ہے آہ جب تاریک نظروں میں
سنوارے بام پر کیا گیسوئے عنبر فشاں کوئی

سنبھال اے ضبط اٹھ کر اضطرابِ دل سے ڈرتی ہوں
کہ نازک ہے زمانہ ہو نہ مجھ سے بدگماں کوئی

جلایا چپکے چپکے آتشِ خاموشِ غم تو نے
بجھائی آگ کب دل کی لگی ابرِ کرم تو نے

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم
اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم
آئی حصّے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضا دئے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کے لئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا
خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبدِ نور میں پُتلا تیرا
یدِ قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو
تو وہ لیلی تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونق خلوت شاہانہ بنایا تجھ کو
نازش ہمت مردانہ بنایا تجھ کو

ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بن کر
چمن دہر میں پھولی گل رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بن کر
دل شوہر میں رہی خال سویدا بن کر

حسن خدمت سے شگفتہ دل شوہر رکھا
کہ قدم جادہ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروت بھی تھی غمخواری بھی
تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوہ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی
درد آیا ترے حصے میں تو خودداری بھی

آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا
تپشِ حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی او! آئینہ سیما تصویر
حسنِ سیرت سے تھی تیری متجلّا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر
تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر
نورؔ ہی نورؔ ترے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رخِ پرنور میں تھا

لب میں اعجازِ حیا چشم فسوں ساز میں تھی
کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تری دیدۂ غمّاز میں تھی
برقِ بیتاب تری جلوہ گہِ ناز میں تھی
یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نارِ عفونت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغِ شرر افشاں ہو کر
کوند اُٹھی قلعۂ چتوڑ میں جولاں ہو کر
یہ وُہ بجلی تھی جو سوزِ غمِ حرماں ہو کر
خاک سے لوٹ گئی تیری پشیماں ہو کر
یہ وُہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

آہ! او عشوہ و انداز و ادا کی دیوی
آہ! او ہند کے ناموسِ وفا کی دیوی
آہ! او پرتوِ انوارِ صفا کی دیوی
او زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی
تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ اب تک
تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ اب تک

آفریں ہے تری جانبازی و ہمت کے لئے
آفریں ہے تری عفت تری عصمت کے لئے
کیا لُٹائیگا زمانہ تری شہرت کے لئے

کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کے لئے
نقش اب تک تری عظمت کا ہے بیٹھا دل میں
تُو وہ دلبر ہے ترا لگتا ہے میلہ دل میں

اکبر الہ آبادی

آپ کا نام سید اکبر حسین تھا۔ اور اکبرؔ تخلّص۔ آپ کا سنِ ولادت ۱۸۴۶ عیسوی تھا۔ وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ مختلف سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے۔ اور ترقی کرتے ہوئے عدالتِ خفیفہ کے جج ہوئے۔ آپ فارسی. عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ منکسر المزاج تھے اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔ ظرافت کے رنگ میں اخلاقی اور قومی شاعری کو آپ نے ایک خاص انداز بخشا ہے آپ نے مذہب. سیاسیات اور سوسائٹی کی خرابیوں کی نکتہ چینی کی ہے روزمرّہ کے انداز میں بے تکلّفی اور شوخیٔ ادا آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ آپ کے کلام کی دو جلدیں آپ کی زندگی میں ہی شائع ہو گئی تھیں باقی حصّۂ کلام آپ کی وفات کے بعد طبع ہوا۔ آپ نے ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا

غزلیات

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

جو خرد مند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

رنجِ دنیا سے بہت مضطرب الحال تھا یہ
دل میں تسکیں ہوئی مذہب کے اثر سے پیدا

کہو کریگا حفاظت مری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ
تو ذرہ ذرہ عالم ہے آشنا میرا

مری حقیقتِ ہستی یہ مُشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پُوچھے کوئی پتا میرا
اُنہیں ہے عقل جو محتاجِ غیر ہے ہر دم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدّعا میرا
غرور اُنہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبرؔ
سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دُنیا کو خُوب دیکھا
اِس نے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا
یا اِس نے خوب سمجھا یا اُس نے خوب دیکھا
نامِ خدا کو اکثر زیبِ زباں تو پایا
عشقِ بُتاں کو لیکن نقشِ قلوب دیکھا
اوروں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنجِ عیوب دیکھا

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبّت کے سوا

آئیگی تجھ کو نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھے آئینۂ فطرت کے سوا

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں پیدا دفتر
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

زندہ ہوں مگر زیست کی لذّت نہیں باقی
ہر چند کہ ہوں ہوش میں، ہُشیار نہیں ہوں

اس خانۂ ہستی سے گذر جاؤں گا بے لوث
سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں

افسُردہ ہوں عبرت سے' دوا کی نہیں حاجت
غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں

وہ گُل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے
اُلجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہوں

یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بُت کے سِتم سے
میں اُس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں

گو دعوئ تقویٰ نہیں درگاہِ خُدا میں
بُت جِس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبر
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا مِلتا نہیں
ڈور کو سُلجھا رہا ہے اور سِرا مِلتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دُشوار ہے
شہرِ تن میں جبکہ خود اپنا پتا مِلتا نہیں

غافلوں کے لُطف کو کافی ہے دُنیاوی خوشی
عاقلوں کو بے غمِ عقبیٰ مزا ملتا نہیں

کشتئ دِل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا مِلتے ہیں لیکن باخدا مِلتا نہیں

غافلوں کو کیا سناؤں داستانِ عشقِ یار
سونے والے مِلتے ہیں دردآشنا مِلتا نہیں

زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

بس یہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج و راحت کی
یہ فقط وقت کا گذرنا ہے

سب سے بدتر بتوں سے ہے اُمید
سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے

گُل سے پوچھو کس انتظار میں ہے
غنچے کو تو ابھی سنورنا ہے

نشہ جن کو چڑھا ہے نخوت کا
اُن کے چہروں کو بھی اُترنا ہے

رُباعیات

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مُضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سُنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذِلّت سے ہو تو مرنا اچھا

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈُوبا پایا
آنکھیں تو بیشمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

لکچر سے نہ ہے' نہ کچھ خیالات سے ہے
تہذیب سے ہے نہ ترکِ عادات سے ہے
اکبرؔ بخدا یہ کامیابی ساری
تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

افسوس سفید ہو گئے بال ترے
لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے
تو زُلفِ بُتاں بنا ہوا ہے اب تک
دُنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال ترے

رُکتا نہیں انقلاب چارا کیا ہے
حیراں ہیں ملک' بشر بچارا کیا ہے
تسکیں کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال
جو کچھ ہے خُدا کا ہے ہمارا کیا ہے

تسبیح و دُعا میں جس نے لذّت پائی
اور ذکرِ خدا سے دِل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اس سے بڑھ کر
بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

قطعات

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پُوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وُہ کیا ہُوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت
کہ ہم کیونکر وہاں کا حال جانیں
لحد تک آپ کی تعظیم کر دی
اب آگے آپ کے اعمال جانیں

مہر

سورج نرائن آپ کا نام تھا اور مہر تخلص۔ آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ آپ نے فارسی، سنسکرت اور انگریزی میں خاصی دستگاہ حاصل کی تھی۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی تحصیلِ علم کرتے رہے بعد میں آپ نے دہلی اور پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں عالی عہدوں پر کام کیا۔ آپ نے فلسفہ اور بالخصوص ویدانت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور خود ایک سچے ویدانتی تھے۔ آپ کا کلام عشقِ روحانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے اخلاقی اور نیچرل نظمیں لکھی ہیں اور انگریزی سے بھی کئی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔

آپ کا مجموعۂ نظم کلامِ مہر کے نام سے شائع ہوا تھا۔
آپ نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔

انتخاب از کلامِ مہر

غزلیات

پہلو میں تُو جو اے دلِ خانہ خراب تھا
سیماب کی طرح سے مجھے اضطراب تھا

پندار اپنا مانعِ دیدار ہو گیا
شاہد کو ورنہ اب ہے نہ پہلے حجاب تھا

گھر تھا زبسکہ بیم و رجا کا دلِ حزیں
ہر روز میرے واسطے روزِ حساب تھا

تیری نگاہِ مست کی اللہ رے شوخیاں
صوفی بھی بادہ کش کی طرح سے خراب تھا

عمرِ عزیز چشم زدن میں بسر ہوئی
گویا ہماری ہستیٔ موہوم خواب تھا

دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے فراقِ دوست
کیسا تمہارے ہجر میں جاں پہ عذاب تھا

جب تک تھی آنکھ بند جُدائی ہمی تھی آ سے
جس وقت چشم وا ہوئی دریا حباب تھا
کھو کر قرارِ حضرتِ دل کیوں ہو مضطرب
یہ تو کتابِ عشق کا پہلا ہی باب تھا

دیکھا جو ان کو جوشِ طرب سے بدل گیا!
اُن کے ستم کا جو گلۂ بے حساب تھا
کہتے ہیں جس کو بندِ علائق وُہی تو مہر
اُس شوخِ بے حجاب کا بندِ نقاب تھا

نہیں آپ کو ہم سے زیبا حجاب
کہ محرم جو ہو اُس سے کیسا حجاب
ہم اور شوقِ دیدار کا تازہ تر
تُم اور وُہ تمہارا پُرانا حجاب
گئے شوقِ دیدار میں جاں سے ہم
مگر تُو نے ظالم نہ چھوڑا حجاب
نگاہِ تصوّر ذرا سکام کر
انہیں ہم سے ہے ہم نے مانا حجاب

ترا حسن برقِ جہاں سوز ہے
نہ ہوتا تجھے تو ہمیں تھا حجاب
تجلّی ہے انوار کی چھن رہی
نہیں برقعِ رُخ تمہارا حجاب
ملے ہر جگہ ہم سے بُرقع میں وُہ
رہا نام و صُورت کا پردہ حجاب
حضُوری ہے ہر وقت غافل تجھُے
اگر ہو نہ پندار تیرا حجاب
اگر کشفِ محجوب مطلوب ہے
اُٹھا پہلے اپنی نظر کا حجاب
کبھی خواب میں بھی دکھایا نہ مُنہ
تمہیں مہرؔ سے کیوں ہے اتنا حجاب

درِ جاناں سے نہ لے جائے خُدا اور کہیں
ہم نہیں جائیں گے اس در کے سوا اور کہیں
کر دیا اُن کی جُدائی نے عزیزوں سے جُدا
میں کہیں اور ہوں اور دل ہے مرا اور کہیں

آپ کے کوچے میں اغیار کہاں آتے ہیں
میں نے ہی دیکھے ہیں نقشِ کفِ پا اور کہیں

گھر سے نکلے تو بنے کعبے کا ارادہ کر کے
شوق کمبخت مگر لے ہی گیا اور کہیں

بے ٹھکانوں کا ٹھکانا ہے ترے کوچے میں
نہ گئے اور نہ جائیں یہ گدا اور کہیں

جب سے عاشق ہوئے ہم دیکھ لیا گھر اس نے
نہیں نازل ہوئی مدت سے بلا اور کہیں

قیس و فرہاد نے آباد کئے دشت و جبل
جا مرے رہنے کو اے عشق بنا اور کہیں

ابتدا میں سنتے ہم عشق کے ارماں کیا کیا
آج ٹالے نہیں ٹلتی یہ بلا اور کہیں

حضرتِ مہر کسی دھن میں چلے آتے ہیں
آنکھ پڑتی ہے کہیں اور تو پا اور کہیں

رُباعیات

دُنیا

آئے ہو تو کچھ یاں کا تماشا دیکھو
رہ کر دنیا میں سیرِ دُنیا دیکھو
دُنیا ہے چار دن کا میلا اے مہر
اور اس میں غضب کا یہ جھمیلا دیکھو

ما و منی

کیوں کہتا ہے ہر چیز کو تُو میری ہے
اے مہر نہ میری ہے نہ یہ تیری ہے
دُنیا سے چلا جانا ہے اک دن اس طرح
گویا کہ کسی فقیر کی پھیری ہے

احباب و اقارب

اپنا دیکھا ہے اور پرایا ہم نے
سو بار ہے سب کو آزمایا ہم نے
اے مہرؔ بنی کا ہے زمانہ ساتھی
بگڑی کا کوئی یار نہ پایا ہم نے

مدارجِ عمر

کہتے ہیں جن کو زندگانی کے مزے
ہیں مہرؔ وہ عالم جوانی کے مزے
پیری میں کبھی جو یاد آ جاتے ہیں
تو ہوتے ہیں معلوم کہانی کے مزے

عمرِ رواں

اچھی بُری سب تیری گذر جائیگی
ہے حق کی رضا جیسی گذر جائیگی
اے مہرؔ بہت گذر چکی عمرِ رواں
تھوڑی سی رہی یہ بھی گذر جائیگی

موت

پیغام اجل آئیگا پر آئیگا
کیا موت کا فکر کرکے پھل پائیگا
دُنیا ہے سرائے پنج روزہ اے مہرؔ
یاں کون رہا ہے کون رہ جائیگا

تناسخ

جو بیج کہ بوئے گئے پھل لائیں گے
اے مہر وہ بیکار نہیں جائیں گے
دُنیا کے خیالات ہیں جن کے دل میں
واپس دُنیا میں وہ ضرور آئیں گے

ایضاً

جب تک ہے خودی ساتھ ہیں اُس کے اعمال
اعمال کے ساتھ ہے تناسخ کا وبال
اِس دورِ مسلسل سے رہائی کے لئے
درکار ہے ذاتِ لایزالی کا خیال

ایضاً

جس طرح سے مہرؔ چھوڑ کر رختِ کہن
کر لیتے ہیں ہم جامۂ نوزیبِ بدن
کرتی ہے حلول اور جسموں میں روح
ہو جاتا ہے کہنہ جبکہ یہ جامۂ تن

یادِ حق

اے مہرؔ بہت گذر چکی عمرِ رواں
تھوڑی سی رہی اس کو بھی سمجھو گذراں
جو دم جاتا ہے پھر نہیں آتا ہے!
کر لو یادِ خدا کہ پھر وقت کہاں

رحمتِ حق

ہے عمر کی رائے میری نسبت کیسی
اور زید کی مجھ پر ہے عنایت کیسی
تو بندۂ عمر و زید ہے اے غافل
تیرے حق میں خدا کی رحمت کیسی

رموزِ عرفاں

ہر شے میں جمالِ دِلربا کو دیکھا
ہر چیز میں شانِ کبریا کو دیکھا
مخلوق میں خالق نظر آیا جس کو
اس دیکھنے والے نے خدا کو دیکھا

ایضاً

زر دار کو کہتے ہیں کہ ہے مال میں مست
بے زر کو یہ کہتے ہیں کہ ہے کھال میں مست
اے مہرؔ یہ مستی ہے فقط کہنے کی
ہے مست وہی جو کہ ہے ہر حال میں مست

ہمہ اوست

قُمری کو تلاش کُو بکُو تیری ہے
بُلبل کو چمن میں جستجُو تیری ہے
ہے عشقِ مجاز میں حقیقت مخفی
ہر رنگ میں رنگ، بُو میں بُو تیری ہے

قطعہ

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تری
وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں
گر تیرا ذکر ہو تو ہو وہ ذکر خیر مہر
گر تیرا نام لیں تو ادب سے لیا کریں۔

چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے کے بعد آپ نے قانون کا امتحان پاس کیا۔ اور لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ اس پیشہ میں آپ نے نمایاں کامیابی حاصل کی ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو آپ ایک مقدمہ کے سلسلے میں بریلی تشریف لے گئے۔ اور سفر میں ہی فالج کا شکار ہو کر آپ نے اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔

آپ ہندوستان کے قادر الکلام قومی شاعر تھے۔ آپ کی زبان پاکیزہ ہے۔ آپ کے اشعار حب الوطنی اور قومیت کے پاک جذبوں سے لبریز ہیں۔ آپ کا کلام "صبح وطن" کے نام سے اردو میں اور ناگری حروف میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

انتخاب از کلام چکبست

غزلیات

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نو گرفتارِ بلا طرزِ فغاں کیا جانیں
کوئی ناشاد سکھا دے انہیں نالاں ہونا

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لئے ممکن نہیں زنداں ہونا

گُل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طُرّۂ دستارِ غریباں ہونا

ہے مِرا ضبطِ جنُوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

ہم اسیروں کی دُعا ہے کہ چمن سے اِک دن
دیکھتے خانۂ صیّاد کا ویراں ہونا

مِٹّی ہیں گُل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشنِ ہندوستاں کے ہیں

ہم سوچتے ہیں رات کو تاروں کو دیکھ کر
شمعیں زمین کی ہیں جو داغ آسماں کے ہیں

صحنِ چمن سے دُور اُنہیں باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مِرے آشیاں کے ہیں

جنّت میں خاک بادہ پرستوں کا دِل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیرِ مغاں کے ہیں

اپنا مقام شاخِ بریدہ ہے باغ میں
گُل ہیں مگر ستائے ہوئے باغباں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

قصے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے
کھوئے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں

خدمتِ انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینہ پہ اُلفت کی جِلا کرتے رہے

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

کیا کہیں کس سے کہیں دنیا میں کیا کرتے رہے
نعمتیں ہوتی رہیں شکرِ خدا کرتے رہے

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

مِٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

دِل وُہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وُہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے

خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سِیکھا
کیا کہوں اور، سلامت مرا صیّاد رہے

تارِ بگڑا ہُوا ہے دِل کو سنبھالوں کب تک
لَے کی پابند کہاں تک مری فریاد رہے

آپ سے ہم سے ہُوا تھا کبھی پیمانِ وفا
کیجئے ظلم مگر وُہ بھی گھڑی یاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیّاد رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اِس شوق میں برباد رہے

حکم مالی کا یہ ہے بھول نہ ہنسنے پائیں
چُپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

برسات

ہے ملاتی یادِ مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی

بندھ گئی ہے رحمتِ حق سے ہوا برسات کی
نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی

اُگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر
انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی

دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آگئی
حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی

ہوں شریکِ بزم مے زاہد بھی توبہ توڑ کر
جھومتی قبلے سے اُٹھی ہے گھٹا برسات کی

وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص
وہ ہوائے سرد وہ کالی گھٹا برسات کی

پار اُتر جائیں گے بحرِ غم سے رندِ بادہ نوش
لے اڑیگی کشتیٔ مے کو ہوا برسات کی

خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں
دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

وہ دعائیں مے کشوں کی اور وہ لطفِ انتظار
ہائے کن نازوں سے چلتی ہے ہوا برسات کی

میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر
تخت پریوں کے اُڑا لائی ہوا برسات کی

ناز ہو جس کو بہارِ مصر و شام و روم پر
سرزمینِ ہند میں دیکھے فضا برسات کی

خاکِ ہند

(۱)

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

(۲)

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یُوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِٔ کہن میں

(۳)

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اِس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اِس چمن کو
سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہُوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

(۴)

دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

(۵)

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں

اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

(۶)

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

(۷)

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

(۸)

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں، اس خاک میں ملیں گے

(۹)

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

اقبالؔ

شیخ محمد اقبال آپ کا نام تھا اور اقبالؔ تخلص۔ آپکی ولادت سیالکوٹ میں ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد وہاں پر پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ بعد میں آپ یورپ گئے۔ انگلستان میں کچھ وقت رہ کر آپ بیرسٹر بنے اور جرمنی سے فلسفہ کی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لے کر واپس آئے۔

آپ کو شروع سے ہی شعر و سخن کا شوق تھا۔ آپ نے حضرت داغؔ دہلوی سے تلمذ کیا۔ آپ ایک عالی مرتبہ مفکر تھے۔ اور اُردو فارسی دونوں کے قادر الکلام شاعر۔ پُرشکوہ مگر بے تکلّف زبان۔ لطیف اور نازک تخیل اور فلسفیانہ انداز آپ کے کلام کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ آپ کے کلام نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ آپ کی نظموں کا ترجمہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔

اُردو میں بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم، فارسی میں پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاویدنامہ اور مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ خودی آپ کی تصانیف میں سے ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

انتخاب از کلامِ اقبالؔ

غزلیات

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو۔ تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وُہ سرود کیا کہ چھپا ہُوا ہو۔ سکوتِ پردۂ ساز میں

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے۔ ترا آئینہ ہے وُہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وُہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں۔ نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جُرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہُوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اَور بھی ہیں

تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

آفتاب

(ترجمۂ گایتری)

اے آفتاب! رُوح و روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو
باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بُود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وُہ آفتاب جس سے زمانے میں نُور ہے
دِل ہے، خرد ہے، رُوحِ رواں ہے، شعُور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعُور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نُور دے

ہے محفلِ وجُود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستئ ہر جاندار میں
تیری نمُود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی ۔ نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

رام

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اُونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہُوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہوُر جن کے دم سے ہے دُنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجُود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا۔ شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبّت میں فرد تھا

گرُو نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منوّر ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دِل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بُت کدہ پھر بعد مدّت کے مگر روشن ہُوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہُوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

ایک آرزُو

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہُوں یا رب
کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہُوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہُوں خامشی پر یہ آرزُو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہُوں، عزلت میں دن گذاروں
دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نِکل گیا ہو
لذّت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا۔ سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمّید اُن کی میرا ٹوٹا ہُوا دِیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کُٹیا مری دِکھا دے
جب آسماں پہ ہر سُو بادل گھِرا ہُوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وُہ صبح کی مؤذن
میں اُس کا ہمنوا ہُوں، وُہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھُولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مِرا وضو ہو، نالہ مِری دُعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مِرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید اُنھیں جگا دے

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جوشؔ ملیح آبادی

آپ کا نام شبّیر حسن خان ہے اور جوشؔ تخلّص۔ آپ ملیح آباد کے ایک مشہور اور باوقار خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی زندگی رسم و روایت کے خلاف بغاوت کی زندگی رہی ہے۔ آپ اِس دَور کے مقتدر اساتذہ میں سے ہیں۔ انگریزی دورِ حکومت میں آپ نے مُدّتوں ہندوستان کے نوجوان اُردو شعراء کی ذہنی رہنمائی کی ہے۔ قوم و وطن کی اُلفت، عالمگیر اخوّت محبّت اور قدرت کے مناظر آپ کے مرغوب مضامین ہیں۔ علوّ بیان زورِ تخیّل اور پاکیزہ جوش آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ طنز میں آپ ایک مخصوص اور بے نظیر اسلوب کے مالک ہیں۔ آپ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں کچھ دیر کام کرتے رہے ہیں۔ ان دنوں آپ "آجکل" دہلی کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔

نثر میں آپ کی تصنیف "اشارات" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ نظم میں شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، عرش و فرش، اور دیگر متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

لمحۂ آزادی

سنو اے ساکنانِ بزمِ ہستی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

شاہِ شہیداںؔ

السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(بر شہادتِ مہاتما گاندھی)

۱

اے زمیں کی جیب کے آئینۂ الماس بار
اے فلک کی بزم کے مہرِ درخشانِ بہار
اے وطن کی سرزمیں کے آسمانِ ذی وقار
اے زمانے کی صدف کے گوہرِ انجم شکار
اے صفا کی موج کے لعلِ درخشاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲)

اے امیرِ کاروانِ پختہ کارانِ وطن
اے فقیرِ تاجدارِ تاجدارانِ وطن
اے امید و ہمّتِ ناکام گارانِ وطن
اے ہلاکِ عشوۂ رنگین یارانِ وطن
اے شکارِ کج روان و کور مغزاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۳)

حیف اے جانِ کرم نخچیرِ پیکانِ ستم
حیف اے صیّادِ عنقائے مسرّت صیدِ غم
حیف اے دُودِ چراغِ کشتۂ طاقِ حرم
حیف اے خاکسترِ پروانۂ بیت الصّنم
اے شہیدِ اتحادِ نوعِ انساں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۴)

دہر پر تیری شہادت نے یہ ثابت کر دیا
حد سے بڑھ کر نیک ہونا کس قدر ہے ناروا
حرفِ حق ہے اہلِ باطل کے لئے طبلِ وغا
سخت ہوتی ہے گناہِ بے گناہی کی سزا
السّلام اے کشتۂ خیرِ فراواں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۵)

قاتلوں میں قتلِ انسانی پہ رونا جرم ہے
تخمِ نیکی سرزمینِ دل میں بونا جرم ہے
جذبۂ خدمت سے راتوں کو نہ سونا جرم ہے
مجرموں کے درمیاں معصوم ہونا جرم ہے
السّلام اے پائمالِ اہلِ عصیاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۶)

دردِ احساسِ یتیمی سے ہر اک دل ہے اداس
جادۂ روشن پریشاں، روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتولِ اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس
صدرِ محفل اُٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس
اے ابو الہند اے خدیوِ کشورِ جاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۷)

تو انوکھا چارہ فرما طرفہ تر دم ساز تھا
تیری پلکوں کے جھپکنے کا عجب انداز تھا
ہر جھپک میں خوش دلی کا سازِ بے آواز تھا
روح پر تیری عیاں مہر و وفا کا راز تھا
مسندِ حسنِ عمل کے اے غزل خواں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۸)

السّلام اے سینۂ اقوام کے دردِ نہاں
السّلام اے مرہم زخم دلِ ہندوستاں
السّلام اے دست گیر و چارہ سازِ بیکساں
السّلام اے آہِ سردِ تیرہ بختانِ جہاں
السّلام اے اشکِ گرمِ سینہ چاکاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۹)

تیرے ہر آغاز میں رعنائیٔ انجام تھی
تیرے میداں میں سیاست مرغِ زیرِ دام تھی
تیرے دستِ آگہی میں نبضِ خاص و عام تھی
سطوتِ افرنگ تجھ سے لرزہ بر اندام تھی
اے گدائے خانہ بر اندازِ شاہاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۰)

اے مریضوں کے طبیب اے خستہ جانوں کے کفیل
اے بہ خلوت موجِ زمزم اے بہ جلوت رودِ نیل
آتشِ نمرودِ عصرِ نو کے بے پروا خلیل
حرّیت کے درسِ اعظم حق کے پیغامِ جلیل
آشتی کے حکم دلداری کے فرماں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۱)

تو امینِ مرحمت آئینۂ ایثار تھا
صحتِ افکارِ انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غمخوار تھا
تو رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا
السّلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۲)

اے گلِ افسردۂ بستانِ حق و راستی
اے سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی
اے شبِ مسروقۂ زلفِ درازِ دلبری
اے چراغِ مُردۂ محرابِ امن و آشتی
اے متاعِ بردۂ گیتا و قرآں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۳)

السّلام اے آسمانِ صدق کے مہرِ مبیں
السّلام اے محفلِ اخلاق کے مسند نشیں
السّلام اے فرشِ خاک آلود کے عرشِ بریں
السّلام اے خاتمِ مہر و محبّت کے نگیں
السّلام اے عصرِ حاضر کے سلیماں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۴)

جادۂ حق پر درخشاں ہیں ترے نقشِ قدم
پرفشاں ہے آسمانِ عدل پر تیرا علَم
اے حسین ابنِ علی کے پیروِ قُدسی حشم
اے یزیدِ عصرِ نو کے کشتۂ ذوقِ ستم
اے صلیبِ تازہ کے عیسئ دوراں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۵)

تیرے طبلِ جنگ میں بھی سازِ موجِ گنگ تھا
تیرے شیشے کے مقابل زرد رُوئے سنگ تھا
خون کی آلودگی سے پاک تیرا رنگ تھا
اَسلحہ سے بے خبر تیرا مذاقِ جنگ تھا
السّلام اے فاتحِ بے تیغ وپیکاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۶)

اے محرم کے افق کی رنگ پرور صبحِ عید
اے محلِ یاس و لونہ میدی کی گل بانگِ امید
اے ثنا خوانِ حسین و دشمنِ شمر و یزید
اے رذیلوں کی رذالت کے لئے ضربِ شدید
اے شریفوں کی شرافت کے نگہباں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۷)

اے خطیبِ دوستی اے دشمنِ بغض و عناد
اے وفا کی آرزو اے قلبِ رحمت کی مراد
اے رسولِ عافیت اے کشتۂ دلوِ فساد
بر تو حیف اے سعیٔ نا مشکورِ امن و اتحاد
اے پریدہ دلو لے پژمردہ ارماں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۸)

تُو ہی اک دانائے کامل بزمِ نادانی میں تھا
روشنی کا تُو منارہ بحرِ طغیانی میں تھا
تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا
نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا
اے غرورِ ہندو و فخرِ مسلماں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۱۹)

اے ہوائے گرم سے پژمردہ باغِ مُشک بار
اے جفائے سنگ سے بشکستہ جامِ زرنگار
موت کے مارے ہُوئے اے زندگی کے تاجدار
اے خزاں کی دُھوپ میں سوئے ہُوئے پیکِ بہار
اے اجل کی ظلمتوں کے آبِ حیواں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲۰)

فقر سے تیرے برستا تھا جلالِ قیصری
حیف اے لیلائے حریت کے قیسِ عامری
ہر تری موجِ نفس تھی اک سرودِ رہبری
تیرے سینے میں دھڑکتا تھا دلِ پیغمبری
اے نواسے انبیائے پاک داماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۲۱)

اے مرے عشرت ندیدہ رہبرِ عبرت مآل
اے مرے گردن بُریدہ عزمِ اتمام و کمال
اے مرے حیواں دریدہ یوسفِ قدسی جمال
اے مرے صرصر رسیدہ بوستانِ حال و قال
اے مرے خاور گزیدہ شبنمستاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

(۲۲)

جب سے تو اے بلبلِ شیریں زباں خاموش ہے
مہر برلب گلستاں ہے باغباں خاموش ہے
بوئے گل آزردہ ہے جوئے رواں خاموش ہے
گلشنِ دیرینۂ ہندوستاں خاموش ہے
السّلام اے ساکنِ شہرِ خموشاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

(۲۳)

اہلِ کیف و صاحبانِ ہوش کے آرامِ جاں
جملہ مردانِ اخوت کوش کے آرامِ جاں
ہر دلِ پر شورش و خاموش کے آرامِ جاں
قبلۂ رندانِ عالم جوشؔ کے آرامِ جاں
اے تب و تابِ امامِ بادہ نوشاں السّلام
السّلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السّلام

محرومؔ

پروفیسر تلوک چند محرومؔ - آپ کی ولادت مغربی پنجاب میں عیسیٰ خیل کے مقام پر ہوئی - اوائلِ حیات میں ہی آپ نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے غزلیں بہت کم لکھی ہیں نظموں میں آپ واحد اور امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُردو کے مقتدر تنقید نگاروں نے آپ کی اُستادی کا احترام سے اعتراف کیا ہے آپ کے الفاظ برجستہ ہیں اور جذبات لطیف اور پاکیزہ - آپ کے اشعار غم و درد کی تصویر ہیں اور سوز و گداز کا مرقّع - آپ کے کلام میں تسکینِ قلب کا پیغام ہے اور عالمگیر صُلح کی تلقین۔

آپ عمر بھر تعلیم کے محکمہ میں رہے ہیں۔ اس وقت آپ پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ آپ کے کلام کے مجموعے "گنجِ معانی" "کلامِ محرومؔ" حصّہ اول، دوم، سوم۔ "رباعیاتِ محرومؔ" اور "مہرشی درشن" شائع ہو چکے ہیں۔

انتخاب از کلامِ محرُوم

ویدِ مقدّس کی روشنی

اگرچہ ہند ہے منّت کشِ ظہُور ترا
عرب میں نور ترا ہے عجم میں نُور ترا
فضائے مشرق و مغرب میں کار فرما تُو
کہیں نہاں ہے ابھی اور کہیں ہویدا تُو
چمک رہا ہے عیاں تیرا آفتاب کہیں
جھلک رہا ہے پسِ پردۂ سحاب کہیں
زماں کی قید سے آزاد لامکاں ہے تُو
خدائے پاک کا پیغامِ جاوداں ہے تُو
پیامِ حق ہے حقیقت نما ہے جلوہ ترا
ضیا فروش ہے ظلمت رُبا ہے جلوہ ترا

فروغِ صدق و صفا ہے تجلّیوں سے تری
دل آئینہ سے سوا ہے تجلّیوں سے تری

ہُوئی ہے تجھ سے منوّر حیات کی منزل
تری چمک سے ہے روشن نجات کی منزل

تجلّیاں نہ ہوں تیری جو باعثِ آرام
سکوں پذیر نہ ہو اضطرابِ استفہام

ضمیرِ پیکرِ خاکی ہے تجھ سے نورانی
دل و دماغ پہ ہے تیری جلوہ افشانی

ازل سے راہ نما تو ہے رُوحِ انساں کی
کہ تیرے جلووں سے روشن ہے راہ ایماں کی

حقیقتِ ازلی! تُو جو دل نشیں ہو جائے
ریاضِ خلد کی مانند سرزمیں ہو جائے

بچّہ

اے کہ اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تُو
کس وطن کی یاد میں روتا ہُوا آیا ہے تُو؟

کون سی دُنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟
رونے والے! یاد کِس کِس کی رُلاتی ہے تجھے؟

کیا کوئی نندیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تُو
گلشنِ فردوس سے مُنہ موڑ کر آیا ہے تُو

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظّارے تجھے
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے

کس لئے حیرت سے یُوں ہر اک کا مُنہ تکتا ہے تُو
کچھ تو کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں سکتا ہے تُو

ہم کو بھی معلوم ہے تُو ہے مسافر دُور کا
مطلقاً اس دیش کی بولی سے ہے ناآشنا

ہاں بتا وُہ سرزمینِ عافیت تھی کون سی؟
بستی ہے دِل میں ترے دلخواہ بستی کون سی؟

روشنی ہوتی ہے کیسی چاند سورج کی وہاں؛
تیرے چہرہ پہ ہویدا ہیں ابھی جس کے نشاں

کس چمن کا گُل ہے تو۔ کس عرش کا تارا ہے تُو؛
کس قدر ہے پاک و روشن ! کس قدر پیارا ہے تُو!

آہ اے نو واردِ ہستی تجھے معلوم کیا
انقلاباتِ زمانہ ہیں مچاتے دھوم کیا

آج روتا ہے تُو جس دُنیا کو زنداں جان کر
کل نہ چھوڑے گا اِسی کو باغِ رضواں جان کر

اس قدر مانوس ہو جائے گا اس دُنیا سے تُو
پھر وطن کی یاد ہوگی اور نہ اُس کی آرزو

یاد بھولے سے نہ آئے گا تجھے اپنا وطن
تُو سمجھ لے گا اِسی غربت کو ہی پیارا وطن

حاصل اِک دن بھی نہ ہوگا گرچہ اطمینانِ دل!
پھر بھی دُنیا ہی رہے گی شاملِ ارمانِ دل!

گنگا جی

جوش زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر
بہہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر
آئی ہے راہروِ عالمِ بالا ہو کر
رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریّا ہو کر
عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منوّر گنگا
مظہرِ نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا

نورِ سیّال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو
حیرت افروزِ دل و دیدۂ حیراں ہے تو
کس دلآویزی و تیزی سے خراماں ہے تو
مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو
حسنِ بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟
پردۂ رُخ ترا جلوہ ہے گریزاں کیوں ہے؟

کیوں گریزاں ہے؟ کہ دنیا کو ضرورت ہے تری
ماحیٔ ظلمتِ عصیاں ابھی طاعت ہے تری

رُوح کو چین ملے جس سے وہ صورت ہے تری
دافعِ آفتِ آلامِ محبّت ہے تری
یاد آجاتی ہیں جس دم تری گنگا، موجیں
مارتا دل میں ہے تقدیس کا دریا موجیں
منزلِ عالمِ اسرار کنارا تیرا
ساحلِ بحرِ حوادث ہے سہارا تیرا
چشمِ جویا کو غنیمت ہے نظارا تیرا
کہ ہے فردوسِ نظر حسنِ دل آرا تیرا
پاک رُوحوں سے تری انجمن آباد رہے
نغمۂ اوم سے ترا چمن آباد رہے

ناپائدار رشتے

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے اُلفت و مہر و وفا کے ہیں

یہ مادر و پدر زن و فرزند و اقربا ء
شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں

اطرافِ مختلف سے نکل آئے ہیں یہاں
ٹھیرے سرائے دہر میں اک جا پہ آکے ہیں

مِل جُل کے جائیں گے نہ بہم ہو کے آئے تھے
رستے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں

آب و ہوائے دہر کی تاثیرِ اُنس سے
پابستہ یہ علائقِ بے انتہا کے ہیں

اِک دُوسرے کے سامنے لپٹتے ہیں پیار سے
تجدید پر گھڑی پیماں وفا کے ہیں

چاہت کا وُہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں
عُمرِ دو روزہ پر انہیں دھوکے بقا کے ہیں

سُنتے نہیں کہ پنبۂ غفلت بگوش ہیں
نقّارے گرچہ بج رہے سر پہ فنا کے ہیں

پِستے ہیں جن میں آدمی نظروں کے سامنے
ارض و سما دو پاٹ اُسی آسیا کے ہیں

محرُوم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں چلتے پھرتے نمونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دِل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

نُورِ جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نُورِ جہاں ہے
مُدّت ہوئی، وُہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دُھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہُوا طُور کا عالم
تُربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے؟
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی، نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر!
یہ دورِ زمانہ کے الٹ پھیر، یہ اندھیر!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر!
اے گردشِ ایام! یہ اندھیر، یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج مِلا ہے
اے چرخ ترے حُسنِ نوازش کا گِلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا!
ہوتا ہے اثر دل پہ اِن آثار سے کیا کیا!
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا!
اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا!

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس رَوضے میں اکثر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمُور ہے یُوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی!

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے
جو نازُکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے

جو گلرُخ و گُل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گُلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمُردہ وُہ گُل دب کے ہُوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دِل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لئے رُوحِ رواں تھے
محبُوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یُوسفِ ثانی، کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچُھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچُھ بھی نہیں ہیں
ٹُوٹے ہُوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہے، دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھُول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وُہ باغ، نہ وُہ قصر نہ اَیواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹُوٹا ہُوا اِک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

جوشؔ ملسیانی

پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی۔ آپ کی پیدائش ۱۸۸۳ء میں ملسیاں ضلع جالندھر میں ہوئی۔

آپ حضرتِ داغؔ دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ اس وقت آپ نے پنجاب کے قصبہ نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر رکھی ہے۔ ادبی مشغلوں میں مصروف، سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ زمانۂ حال میں اردو ادب کے مشاہیر ارکان میں سے ہیں۔ آپ کی زبان اور تخیل دونوں شستہ ہیں۔ دل کے گہرے جذبات۔ سادہ الفاظ اور بے تکلف انداز میں ادا کرتے ہیں۔

آپ کا ایک مختصر مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" کے نام سے کچھ سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ حال ہی میں آپ نے دیوانِ غالبؔ کی شرح بھی لکھی ہے۔ آپ رسالہ رہنمائے تعلیم کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

انتخاب از کلامِ جوش ملسیانی

غزلیات

اِتنا گمراہ نہ کر ناصحِ ناداں مجھ کو
بڑھ کے ایماں سے ہے وہ دشمنِ ایماں مجھ کو

سوزشِ داغِ دروں سے نظر آتا ہے یہی
پھونک دیگا یہ چراغِ تہِ داماں مجھ کو

اس کے چکر میں بھی برباد ہُوا جاتا ہُوں
گردشِ جام بھی ہے گردشِ دوراں مجھ کو

ہوسِ سیرِ گلستاں ہے خدا خیر کرے
خواب میں بھی نظر آتے ہیں بیاباں مجھ کو

آج وہ شانِ کریمی ہیں دکھانے والے
کہیں رُسوا نہ کرے تنگیٔ داماں مجھ کو

گھر سے وحشت میں نکلتا ہوں جو صحرا کی طرف
پاؤں پڑ پڑ کے مناتا ہے گریباں مجھ کو

میرے اعمال ہوں سرسبز الٰہی کیوں کر
تُو نے پیدا ہی کیا سوختہ ساماں مجھ کو

گرم اشکوں سے مرے دل کی لگی کیا بجھتی
کر گئے اور بھی یہ شعلہ بہ داماں مجھ کو

کوئی ہمدم نہیں مونس نہیں دم ساز نہیں
کس جگہ چھوڑ گئی عمرِ گریزاں مجھ کو

ہوسِ جاہ رہی مانعِ طاعت اے جوش
سروساماں نے کیا بے سروساماں مجھ کو

کس بلا کا حُسن ہے اے رُوحِ گلشن پھول ہیں
خود تری تصویر کا ہے رنگ و روغن پھول ہیں

حُسن ہو تو داد دیتے ہیں خود اہلِ حُسن بھی
رنگِ گُل کو ہم نے دیکھا گُل بہ دامن پھول ہیں

آنکھ ڈالی جس نے وہ مسحور ہو کر رہ گیا
چھپ کے بیٹھا ہے کوئی تو سامری فن پھول ہیں

اس جہانِ رنگ و بو میں ڈھونڈتا آباد ہیں
اپنا مندر تو بنالے اے برہمن پھول میں

اللہ اللہ یہ بہارِ حسن، یہ رنگینیاں
پھول گلشن میں نظر آیا کہ گلشن پھول میں

چھلکے دو چار ساغر اور اے ساقی لنڈھا
خوب تر کر دے مری توبہ کا دامن پھول میں

یہ تری قسمت ہے کانٹے بو دیئے اے عندلیب
بے طرح الجھا ہوا ہے تیرا دامن پھول میں

اے خزاں اب خار و خس میں بھی جگہ پاتا نہیں
آہ وہ طائر کہ تھا جس کا نشیمن پھول میں

اس غزل میں جوشؔ تم نے رنگِ معنی بھر دیا
کھینچ دی کیا خوب تصویرِ گلشن پھول میں

کلغی والا

جی میں ہے حسنِ عقیدت کا بیاں ہو جائے
دسویں شاہی کی ثنا ورد زباں ہو جائے
آج کچھ طرۂ مضموں کی دکھانی ہے پھبن
کلغی والا مرا عنوانِ بیاں ہو جائے

اے گورو تو نے یہ چاہا کہ خزاں دیدہ وطن
ایک گل دستۂ گلزارِ جناں ہو جائے
رائج الوقت نہ ہو شرکِ دوئی کا زرِ قلب
سکۂ توحیدِ عیانی کا رواں ہو جائے

کہہ دیا تو نے کہ ہر دل میں ہو وہ شوقِ جمال
سات پردوں میں جو پنہاں ہو عیاں ہو جائے
ڈھونڈھ لو اس بتِ رعنا کو صنم خانوں میں
دل میں آ کر جو خدائے دو جہاں ہو جائے

اے گورو تجھ کو تمنا تھی کہ آزاد ہوں سب
دور دنیا سے غلامی کا نشاں ہو جائے

تُو نے ہر دل میں وُہ جُرأت وہ بسالت بھر دی
جس سے روباہ بھی اِک شیرِ ژیاں ہو جائے

تیرے پیمانۂ دل میں وُہ بھرا تھا امرت
زالِ دُنیا اُسے پی لے تو جواں ہو جائے

منجمد قوم کو تُو نے وُہ روانی بخشی
جس کے مذکور سے ہر نظم رواں ہو جائے

آہ پھر قوم ہُوئی جاتی ہے بیگانۂ ہوش
کیوں نہ ہر نالۂ غم برقِ طپاں ہو جائے

معبدوں کا بھی تو اب پاسِ تقدس نہ رہا
کیوں نہ ہر نغمۂ ناقوس فغاں ہو جائے

آج پھر باغِ وطن خشک نظر آتا ہے
پھر وہی ابرِ کرم فیض رساں ہو جائے

تیرے ہاتھوں نے یہ سینچا تھا خبر لے اس کی
کہیں ایسا نہ ہو پامالِ خزاں ہو جائے

آنسو

اشک کہتا ہے بتاؤ تو مجھے کیا میں ہوں
چیستاں ہوں نہ پہیلی نہ معمّا میں ہوں

سر بسر رنج و غم و یاس کی تصویر ہوں میں
ہمہ تن حسرت و اندوہ و تمنّا میں ہوں

دِل کے ڈوبے ہوئے ارمان ہیں لاکھوں مجھ میں
لوگ قطرہ جسے کہتے ہیں وہ دریا میں ہوں

عہد طفلی میں ملا داغِ یتیمی مجھ کو
اپنی پھوٹی ہوئی تقدیر کو روتا میں ہوں

ہو گیا آگ سے پانی کا نکلنا ثابت
دل میں کچھ سوز ہو پیدا تو ہویدا میں ہوں

آئینہ لوگ مجھے سمجھیں وہ حیراں ہوں میں
آنکھ جس پر سے نہ اُٹھے وہ تماشا میں ہوں

مجھ سے حالِ بازی کو عزت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

شورِ فریاد و فغاں کیوں نہ مرے ساتھ رہے
آرزوئے دلِ مضطر کا جنازا میں ہوں
ہوگا دنیا میں نہ مجھ سا بھی کوئی تردامن
اپنی ہی شرم و خجالت کا پسینا میں ہوں

گر پڑا آنکھ سے منت کشِ مژگاں نہ ہوا
مِل گیا خاک میں شرمندۂ احساں نہ ہوا

رُباعیات

ہر ایک کے دل میں کبر ہستی دیکھا
ہر ایک کے سر میں شورِ مستی دیکھا
پائی نہ کہیں خدا پرستی ہم نے
ہر چیز میں رنگِ خود پرستی دیکھا

مشکل کا یہ اصرار کہ اب کام نہ کر
مقصد کی یہ تاکید کہ آرام نہ کر
اُٹھ باندھ لے ہمت کی کمر اے ناداں
آغاز کو شرمندۂ انجام نہ کر

دُنیا میں جسے کسبِ کمال آتا ہے
دولت ہی سے قدر و منزلت پاتا ہے
زردار کے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول
بے زر کا ہُنر بھی عیب ہو جاتا ہے

تقدیر جب آبِ زر سے مُنہ دھوتی ہے
آلودہ نہ گردِ غم سے کب ہوتی ہے
زردار کے گھر میں رنج و غم ہنستے ہیں
نادار کی دُنیا میں خوشی روتی ہے

کچھ اپنی کرامت بھی دکھا اے ساقی
جو کھول دے آنکھیں وہ پلا اے ساقی
ہشیار کو دیوانہ بنایا بھی تو کیا
دیوانے کو ہشیار بنا اے ساقی

فراقؔ گورکھپوری

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم شری گورکھ پرشاد عبرتؔ چوٹی کے وکیل تھے۔ انگریزی ادب میں ایم اے کے امتحان میں فراقؔ تمام امیدواروں میں اوّل رہے۔ آپ آئی. سی. ایس میں منتخب ہوئے لیکن ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کو ترک کرکے آپ کانگریس کی قومی تحریک میں شریک ہوئے۔ اور ڈیڑھ برس تک قیدِ فرنگ میں رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے آپ الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ آپ نے متعدد زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ موجودہ دور کے عظیم مرتبہ شاعر اور نقّاد ہیں۔ آپ نے اردو شعر کو خاص 'ہندوستانی' رنگ دینے کی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔ آپ کے اشعار میں لوچ ہے اور رَس۔ آپ کے جذبات موسیقی سے لبریز ہیں۔ آپ نے دلکش اور رواں بحروں کا استعمال کیا ہے نثر و نظم میں آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ یہ ہیں نثر میں حاشیے اور غزلیات کے مجموعے رمز و کنایات، شبنمستان اور شعلۂ ساز۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ روپ کے نام سے طبع ہوا ہے۔

انتخاب از کلامِ فراقؔ گورکھپوری

غزلیات

گفتگو اور ہے عبارت اور
اِن نگاہوں کی ہے حکایت اور

کفر و ایماں سے رکھ معاف کہ ہم
رکھتے ہیں مذہبِ محبّت اور

مستی و ہوش پر نہیں موقوف
نگہِ ناز کی ہے نیّت اور

آج بھی نیند آئی جاتی ہے
یہ قیامت میں ہے قیامت اور

روز و شب کیا رُخ اور گیسو کیا
عشق کا نورؔ اور ظلمت اور

کچھ نہ وحدت میں ہے نہ کثرت میں
اس کی خلوت ہے اور جلوت اور
شوخی و جور کیا، تغافل کیا
مجھ کو ہے حسن سے شکایت اور
عشق بھی جرم، ترکِ عشق بھی جرم
یہ مصیبت ہیں ہے مصیبت اور
دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیوں
ہو گئی اہلِ دل کی حالت اور
دیکھ کر بھی اُسے نہ دیکھ سکے
بڑھ گئی ہے نظر کی حیرت اور
اُس سکوتِ نظر کی آج فراق
داستاں اور ہے حکایت اور

حدِ دُنیا عدم اور لامکاں دُور
کچھ اس سے اور اسے عمرِ رواں دُور
اسیرو! پھیر ہے قسمت کا ورنہ
قفس سے کس قدر ہے آشیاں دُور

محبت بے نیازِ پرسشِ غم
نگاہِ لطف سے ناکامیاں دُور

زمانہ چھپتا جاتا ہے نظر سے
لئے جاتی ہے یادِ رفتگاں دُور

نصیبِ آرزو جو کچھ سُنا دے
"نہیں" ہے دُور اس لب سے نہ "ہاں" دُور

زمانے میں نہ ڈھونڈھ اہلِ فنا کو
کہ مٹتے ہیں نشانِ بے نشاں دُور

کہاں تو اور کہاں غم خانۂ عشق
یہ کون آیا گمانِ بدگماں دُور؟

شبِ فرقت کے سناٹوں میں اکثر
صدا آتی ہے میں تجھ سے کہاں دُور؟

فراقؔ اس کو وفا سے کد نہیں ہے
نہ لے جا اس قدر وہم و گماں دُور

ہوئے سب مہرباں نامہرباں دُور
یہ مجبوری! زمیں سخت، آسماں دُور

نشاط و غم سے دل کو لے اُڑے ہیں
ان آنکھوں کے اشاراتِ نہاں دُور

نظر کو ترجمانِ غم نہ کیجے
کہ پہنچے گی یہ شرحِ داستاں دُور

نہ کر پسماندگاں سے فکرِ منزل
ابھی تو ہے غبارِ کارواں دُور

قفس والوں کی بھی کیا زندگی ہے
چمن دُور، آشیاں دُور، آسماں دُور

ذرا صبر اے حیاتِ دورِ حاضر
نہیں اتنی بھی مرگِ ناگہاں دُور

یہ کیا وحشت یہ شوریدہ سری کیا؟
فراقؔ اس کا ابھی ہے آستاں دُور

جنونِ کارگر ہے اور میں ہوں
حیاتِ بے خبر ہے اور میں ہوں

مٹا کر دل نگاہِ اوّلیں سے
تقاضائے دگر ہے اور میں ہوں

مبارکباد ایامِ اسیری
غمِ دیوار و در ہے اور میں ہوں
تری جمعیتیں ہیں اور تو ہے
حیاتِ منتشر ہے اور میں ہوں
ٹھکانا ہے کچھ اس عذرِ ستم کا
تری نیچی نظر ہے اور میں ہوں
فراقؔ اِک ایک حسرت مٹ رہی ہے
یہ ماتم رات بھر ہے اور میں ہوں۔

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اُڑانے میں
جنوں کا نام اُچھلتا رہا زمانے میں
فراقؔ دوڑ گئی رُوح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں
جنوں سے بھول ہوئی دل پہ چوٹ کھانے میں
فراقؔ دیر ابھی تھی بہار آنے میں
وہ کوئی رنگ ہے جو اُڑ نہ جائے اے گلِ تر
وہ کوئی بُو ہے جو رسوا نہ ہو زمانے میں

وہ آستیں ہے کوئی جو لہو نہ دے نکلے
وہ کوئی حسن ہے جھجکے جو رنگ لانے میں

یہ گُل کھلے ہیں کہ چوٹیں جگر کی اُبھری ہیں
نہاں بہار ہے مخفی بلبل ترے ترانے میں

بیانِ شمع ہے حاصل یہی ہے جلنے کا
فنا کی کیفیتیں دیکھ جھلملانے میں

کسی کی حالتِ دل سن کے اٹھ گئیں آنکھیں
کہ جان پڑ گئی حسرت بھرے فسانے میں

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل ہمیں بلبل ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں

مدتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے
کیا کریں یہ ترے انکار کہ انکار سے ہیں

کہدیا تو نے جو معصوم تو معصوم ہیں ہم
کہدیا تو نے گنہگار، گنہگار سے ہیں

سرفروشانِ محبت پہ ہیں احسان ترے
تیرے ہاتھوں یہ سبکدوش گرانبار سے ہیں

خیر خوش ہولے اشاراتِ نہاں سے کوئی روز
آشنا ہم بھی کچھ اے دل نگہِ یار سے ہیں

شکوۂ جور و تقاضائے کرم سب بیسود
کیوں مگر پردۂ انکار میں اقرار سے ہیں

وہی ہم ہیں وہی تم ہو وہی دل ہے لیکن
کچھ نہ کچھ سب کے بدلتے ہوئے آثار سے ہیں

جس کو دکھنے کی طرح آئے نہ دکھنا بھی فراق
تنگ آئے ہوئے ہم تو دل بیمار سے ہیں

قطعہ

آج بھی کام محبّت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبّت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

عرشؔ ملسیانی

آپ کا نام بالمکند ہے اور عرشؔ تخلص۔ آپ کی ولادت ۱۹۰۸ سنِ عیسوی میں ہوئی۔ آپ جوشؔ ملسیانی کے خلفِ رشید ہیں آپ گورنمنٹ انجینئرنگ کالج رسول سے اوورسیئر بنے۔ اس کے بعد آپ نے مختلف اداروں میں کام کیا۔ اس دوران میں بھی ذوقِ شعر اور شوقِ ادب غالب رہا۔ ملازمت کرتے ہوئے ہی آپ نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ آجکل آپ "آج کل" دہلی کے مدیر ہیں۔

آپ کے اشعار میں حرارت ہے اور تڑپ۔ آپ کے انداز میں پختگی اور استواری ہے۔ دورِ جدید میں آپ نے طرزِ قدیم کی علمبرداری کی ہے۔ آپ زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پہ لکھتے ہیں۔ تاہم کلام میں پُرکیف تغزل کا عنصر سب سے نمایاں ہے۔ آپ کا کلام "ہفت رنگ" کے نام سے حال ہی میں طبع ہوا ہے

انتخاب از کلامِ عرش ملسیانی

غزلیات

عشق کو محوِ ناز ہونے دے
حُسن سے بے نیاز ہونے دے

رکھ نہ درماں سے آسرا کوئی
درد کو چارہ ساز ہونے دے

آہ میں آ ہی جائے گی تاثیر
آہ کو دل گداز ہونے دے

ترکِ اُلفت کا آگیا الزام
اب تو افشائے راز ہونے دے

ہے تجھی پر ستم تو پھر اُن کو
خُوگرِ امتیاز ہونے دے

حُسن تو ہے ازل سے عشق طراز
عِشق کو حُسن ساز ہونے دے

چھپ نہیں سکتے تجھ سے وُہ اَے عرش
دیدۂ دل تو باز ہونے دے

دیکھ ساون کی یہ ہوا ساقی
ابر آیا ہے تُو بھی آ ساقی
مے کا پینا خطا سہی لیکن
مے پلانا نہیں خطا ساقی
داد دے ظرفِ مے کشی کی مجھے
خُوب جی کھول کر پلا ساقی
تیری آنکھیں ہی کچھ کریں تو کریں
میری قِسمت کا فیصلا ساقی!
آہ تیرا تغافلِ جاں سوز
آہ برسات کی ہوا ساقی
میں ترے دل کو آزماؤں گا
تُو مرا ظرف آزما ساقی

وعظ سُننے کو ہم نہیں آئے
کیا سزا اور کیا جزا ساقی

پینے والے خدا کے بندے ہیں
اور تُو بھی ہے با خُدا ساقی

ہاں رہے تیرا میکدہ آباد
ہے فقیروں کی یہ دُعا ساقی

عشقِ بُتاں کا لے کے سہارا کبھی کبھی
اپنے خدا کو ہم نے پُکارا کبھی کبھی

آسودہ خاطری ہی نہیں مطمحِ وفا
غم بھی کیا ہے ہم نے گوارا کبھی کبھی

اس انتہائے ترکِ محبّت کے باوجود
ہم نے لیا ہے نام تمہارا کبھی کبھی

طوفاں کا خوف ہے ابھی شاید کرشمہ کار
آتا ہے سامنے جو کنارا کبھی کبھی

بھٹکے تو میکدے میں نمازوں پہ آگئے
یوں عاقبت کو ہم نے سنوارا کبھی کبھی

تنہا روی نے رکھّی ہمارے جنوں کی لاج
گو اہلِ کارواں نے پُکارا کبھی کبھی

گو عشرتِ الم میں معاون تھی اُن کی یاد
ہم نے لیا مگر یہ سہارا کبھی کبھی

اب کیا کہیں دلِ مُتلّون مزاج کو
اکثر یہ آپ کا ہے ہمارا کبھی کبھی

دل غرقِ عیش ہو کے ہُوا لاکھ مطمئن
طوفانِ غم نے پھر بھی اُبھارا کبھی کبھی

پیہم ستم سے عشق کی تسکین ہو نہ جائے
اے دوست التفات خدارا کبھی کبھی

زاہد بھی چُوم لیتا ہے پیرِ مغاں کا ہاتھ
پاکر ترے کرم کا اشارا کبھی کبھی

فریادِ غم سے عرشؔ سنبھلتا ہے دل مگر
لیتے ہیں اہلِ دل یہ سہارا کبھی کبھی

غمِ ماحول

چلیں گی دہر میں بربادیوں کی آندھیاں کب تک
چراغِ عظمتِ آدم نہ ہوگا ضوفشاں کب تک

نظامِ برہمِ عالم کا ماتم تا بہ کَے ہوگا
رہے گا سر نگوں تنظیمِ انساں کا نشاں کب تک

توہم کو ملے گا نام کب تک عقل و دانش کا
غبارِ راہ پر ہوگا گمانِ کارواں کب تک

چلے گی بحث کب تک دوزخ و جنّت کے جھگڑوں کی
رہے گی عقلِ انساں مبتلائے این و آں کب تک

وہ انساں جورِ انساں سہہ کے بھی جو اُف نہیں کرتے
نہ سمجھی جائے گی اُن بے زبانوں کی زباں کب تک

فروغِ جاں نہ ہوگی روشنی کب تک بصیرت کی
رہیں گے داغِ دل بن کر جہالت کے نشاں کب تک

ہنسی کب تک اڑے گی عظمتِ اولادِ آدم کی
رہے گی آدمیت ایک جنسِ رائیگاں کب تک
کبھی تو چھیڑ سازِ دل پہ کوئی پُر اثر نغمہ
غمِ ماحول میں اے عرشؔ یہ آہ و فغاں کب تک

آزاد

آپ کا نام جگن ناتھ اور آزاد تخلّص ہے۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۸ء میں مغربی پنجاب کے قصبہ عیسیٰ خیل میں ہوئی۔ آپ محرومؔ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ آپ نے گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ کی طبیعت بچپن سے ہی موزوں تھی۔ پہلے کچھ کم لکھا کرتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے خوب لکھا ہے۔ اور نام پایا ہے۔ انسانی زندگی کی کشاکش اور سیاسی اور سماجی مسائل کو آپ نے اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ آپ کے اشعار میں ایک حسّاس طبیعت اور ایک پُر اخلاص قلب کی جھلک ہے۔ آپ کے اندازِ بیان میں جوش ہے اور درد۔ ان دنوں آپ 'آجکل' دہلی کے مدیر ہیں۔

آپ کے کلام کے دو مجموعے 'بیکراں' اور 'ستاروں سے ذرّوں تک' طبع ہو چکے ہیں۔ اور ایک مثنوی 'اُردو' بھی شائع ہوئی ہے۔

انتخاب از کلام آزاد

غزلیات

پھر حُسنِ خود نما پہ نظر کر رہا ہُوں میں
پھر امتحانِ قلب و جگر کر رہا ہُوں میں

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم سکوتِ شب
نالوں سے چاکِ شب کا جگر کر رہا ہُوں میں

دُنیا میں مجھ کو جنسِ وفا کی ہے جستجُو
خاشاک میں تلاشِ گہُر کر رہا ہُوں میں

اب دل کو ناپسند ہے پھُولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہُوں میں

پھر دل میں آرہی ہے کسی بیوفا کی یاد
دُنیائے دل کو زیر و زبر کر رہا ہُوں میں

اب لطفِ صبح و شام گیا صبح شام سے
کچھ اس طرح حیات بسر کر رہا ہوں میں
تسکینِ جانِ زار! ترے انتظار میں
گو جاںگزا ہے صبر مگر کر رہا ہوں میں

محبت میں انہیں اہلِ نظر کامل سمجھتے ہیں
جو اس طوفان کی ہر موج کو ساحل سمجھتے ہیں
کبھی وہ دن تھے اپنے دل کو ہم اپنا نہ کہتے تھے
مگر اب ہر بشر کے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں
سنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ منزل کو بھی ہم تو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
وہ فن جو تاب لا سکتا نہ ہو دردِ زمانہ کی
ہم ایسے فن کو اک افسانۂ باطل سمجھتے ہیں
وہی انسان ساحل پہ جنہیں طوفاں کا دھوکا ہو
اگر اڑ جائیں طوفانوں کو بھی ساحل سمجھتے ہیں
ہمیں نے اے محبت قدر پہچانی ہے کچھ تیری
تجھے طوفاں تجھے کشتی تجھے ساحل سمجھتے ہیں

خفا ہونا نہ اے اہلِ زباں! میرے تکلم پہ
یہ وہ طرزِ سخن ہے جس کو اہلِ دل سمجھتے ہیں
ہمارا ارتقاء آزاد! فنِ شعر میں یہ ہے
بہت آساں سمجھتے تھے بہت مشکل سمجھتے ہیں

قطعہ

اب کے تو رنگ و بو کا تماشا ہی اور ہے
یوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے ہیں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
وہ دن بھی تھے کہ شوق کی دنیا تھی اور ہم
شیرازۂ خیال پریشاں نہ تھا کبھی
انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

عزائم

دامنِ گیتی پہ نقش اپنا بٹھاتے جائیں گے
اِس طرح اپنا قدم آگے بڑھاتے جائیں گے

سُست گامی کا گِلہ کیا وادیٔ پُرخار میں
جب چلیں گے ہم نئے رستے بناتے جائیں گے

محفلِ احباب کے اِس بے سُرے ماحول میں
ہم نئے نغمے نئے سازوں پہ گاتے جائیں گے

رنگ و بُو کی انجمن میں شور کیوں برپا کریں
مُسکراتے جائیں گے ہم گُنگُناتے جائیں گے

کہنہ لَے سے رُوح کو تسکین مِل سکتی نہیں
اپنی دُھن میں اپنی ہی تانیں اُڑاتے جائیں گے

اِس جہاں اور اِس جہاں کی تلخیوں کے روبرو
رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے

راہ میں گر حادثے آتے ہیں آنے دو انہیں
حادثوں پر قہقہے پیہم لگاتے جائیں گے

نام لیوا درد کا کوئی یہاں ہو یا نہ ہو
دوستو! ہم درد کی دولت لٹاتے جائیں گے

ہاں ہمارے فیصلوں میں فیصلہ اک یہ بھی ہے
دوست بنتے جائیں گے دشمن بناتے جائیں گے

روکنے کے شوق میں کوئی جو آئے گا تو ہم
بے نیازانہ قدم آگے بڑھاتے جائیں گے

ہم کوئی فتنہ کہیں بیدار دیکھیں گے اگر
اپنے سحر انگیز نغموں سے سلاتے جائیں گے

اپنے اشکِ گرم و آہِ سرد کی تاثیر سے
خرمنِ ہستی کی آتش کو بجھاتے جائیں گے

اِس جہاں کو بخش کر اے دوست! جنّت کا جمال
قہقہے جنت کی دُنیا پر لگاتے جائیں گے

اور اگر آئے نظر بے رنگ تصویرِ جہاں
خونِ دل کے رنگ سے رنگیں بناتے جائیں گے

چشمِ عالم میں تجلّیٰ کی کمی دیکھیں گے جب
نُور بن کر چشمِ عالم میں سماتے جائیں گے

مختصر یہ ہے کہ اے آزادؔ اپنے آس پاس
عزم سے اپنی نئی دُنیا بساتے جائیں گے

فرہنگ

کلام درد

صفحہ ۱۹۔ آپ سے .... ہم سے جو ہو سکا وہ کر کے دیکھ لیا۔

مسیحائی ۔ مسیح یا مسیحا حضرت عیسیٰ کا لقب ہے۔ آپ اپنے معجزے کی طاقت سے مُردے کو زندہ کر دیتے تھے۔

مسیحائی کرنا ۔ زندہ کر دینا۔ مرتے ہوئے کو بچا لینا۔

زور ۔ از حد۔ بہت۔

قصہ مختصر ہونا۔ کام تمام ہونا جان سے گذرنا۔

ص ۲۰۔ **غنچۂ دل** ۔ دل کی کلی ۔ **دل گرفتہ** ۔ مرجھایا ہوا۔

کبھو ۔ لفظ کبھی کی پرانی صورت۔

یگانہ ۔ (۱) اپنا (۲) بے نظیر ۔ بے مثل۔

بیگانگی ۔ اجنبی ہونا۔ پرایا پننا۔ بے رُخی کرنا۔

اذیت۔ تکلیف۔ دکھ۔

داغ ۔ دھبہ۔ نشان۔ دل یا جگر کا داغ = دل یا جگر پہ صدمہ یا رنج کا نشان۔

سرو چراغاں۔ سرو کے درخت کی شکل کا ایک جھاڑ جو محفلوں میں روشن کیا جاتا ہے۔

تغافل ۔ بے التفاتی ۔ بے رُخی۔

حجاب - پردہ -

کسو - کسی کی متروک صورت ہے -

ص ۲۱ - ہم صفیر - ہمنوا - ہم آواز - مل کر چہچہانے والے پرندے -

ماتم کدہ - سوگ کا گھر - غم کا گھر -

ٹک - کچھ - تھوڑی سی دیر کے لئے -

کثرت نمائیاں - وحدت - (ہندی - ایکتا) کے مقابلے میں

کثرت (انیکتا) - کثرت کی یہ نمود و نمائش مٹ

جائے - اور فقط وحدت رہ جائے -

ہُو - خدا کا نام -

تر دامنی - دامن کا گیلا ہونا - آلودہ ہونا - گنہگاری -

ص ۲۳ - زاہدان - جمع زاہد کی - زاہد = پارسا - پرہیزگار -

بیعت کرنا - مرید ہونا -

اودھر - ادھر کی پرانی صورت -

آہ ! = اے "آہ" !

افسوں چلے - جادو اثر کرے -

دلریش - دل + ریش - زخمی دل والا -

ص ۲۴ - شرر - چنگاری -

کیدھر - کدھر کی متروک صورت -

تند خو - تیز مزاج والا -

ص ۲۵ - دید وادید - ملنا جلنا - ملاقاتیں -

بے خبر تیغ یار رکھتے ہیں - محبوب بے خبر ہیں - جو اپنے پاس

تلوار رکھتے ہیں۔

ص ۲۶۔ کبھو۔ متروک برائے کبھی۔

ص ۲۷۔ پرکھا۔ جانچ۔ آزمائش۔

کلامِ میرؔ

ص ۳۰۔ سخن مشتاق۔ مشتاقِ سخن کے لئے اضافت مقلوب۔ کلام کا شائق۔

مرجع آدم۔ انسانوں کا مرجع۔ لوٹنے کی جگہ۔ آخری ٹھکانا۔

قدِ خم۔ جھکا ہوا قد۔

اودھم۔ ہنگامہ۔

ص ۳۱۔ گورِ غریباں۔ بیکسوں کا قبرستان۔

کہنہ خرابی۔ پرانا کھنڈر۔

چشم ہے۔ اُمید ہے۔

سودا۔ جنون۔ دیوانگی۔ سودا کے علاج کے لئے نشتر سے خون نکالا جاتا ہے۔

ص ۳۲۔ ناصح۔ نصیحت کرنے والا۔ پندگو۔ واعظ۔

جرس۔ قافلے کی گھنٹی۔

ص ۳۳۔ غیرتِ یوسف۔ یوسف۔ آپ حضرت یعقوب کے بیٹے تھے اور حسن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ غیرتِ یوسف بیش بہا۔

مقدور تک ۔ مقدور ۔ طاقت ۔ رسائی ۔ جہاں تک ہو سکا ۔
سجدہ ۔ ماتھا ٹیکنا (نماز میں سر جھکانا)
ص ۳۴۔ کوفت ۔ آزار ۔ درد ۔
تصنع ۔ تکلف ۔ دکھاوے کی بات ۔
کسّے ۔ کس سے ۔
بے ستوں ۔کوہ کن ۔ بے ستوں یا کوہ بہستوں ۔ ایران کا ایک
مشہور پہاڑ ۔ کوہ کن ۔ پہاڑ کھودنے والا، فرہاد
جس نے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے کوہِ بے ستوں
کو کھود کر نہر نکالی تھی ۔
ص ۳۵۔ مجنوں ۔ قیس عامری ۔ جسے لیلےٰ سے محبّت تھی ۔
دِوانے نے ۔ دیوانے نے ۔
جس بار نے گرانی کی ۔ اشارہ اس امر کی طرف کہ جب خدا
نے کائنات کی آفرینش کی تو دنیا میں اپنا ایک نائب
بنانا چاہا ۔ پہاڑ ۔ زمین اور آسمان سب نے اس امر
سے انکار کر دیا ۔ لیکن آدم نے یہ بوجھ اٹھا لیا ۔
ص ۳۶۔ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ۔
میر جب دہلی سے لکھنو پہنچے ۔ تو ایک سرا میں اترے
وہاں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا ۔ آپ بھی شریک
ہونے کے لئے وہاں جا پہنچے ۔ ان کی قدیمانہ وضع
قطع سب کی ہنسی کا موضوع بنی ۔ یہ الگ ایک
طرف ہو کر بیٹھ رہے ۔ آخر جب شعر پڑھنے کے لئے

شمع آپ کے سامنے لائی گئی۔ تو سب کی نظر آپ پر پڑی۔ حاضرین میں سے بعض نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میرؔ نے اس موقعہ پر یہ قطعہ فی البدیہہ پڑھا (ماخوذ از آب حیات)

کلام انشا

ص ۳۸۔ نیرا ہی نام الٹا۔ لفظ انشا کی ترتیب حروف کو الٹ کر۔

ص ۳۹۔ فرہاد۔ دیکھئے صفحہ ۱۹۷۔

ص ۴۰۔ مدام۔ ہمیشہ

مہ جبیں۔ چاند کی سی پیشانی والا۔ خوبصورت۔

حور عین۔ بہشت کی سیاہ چشم حسین عورت۔

محمل نشین۔ کجاوے میں بیٹھنے والی۔ مجنوں کی محبوبہ لیلی۔

خاقان۔ چین اور ترکستان کے بادشاہوں کا لقب۔ سلطان

ص ۴۱۔ جبرئیل۔ فرشتہ جبرئیل جن کے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ وہ پیغمبروں کو وحی پہنچایا کرتے ہیں۔

کمر باندھے ہوئے۔ انشاؔ اور ان کی اس غزل کے بارے میں اردو کے شاعر میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ ایک بار جب وہ لکھنؤ گئے۔ تو ایک سرا میں اترے۔ پاس ہی ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔

یہ بھی وہاں جا پہنچے۔ یہ بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے۔ سر پر ایک میلا سا پھینٹا۔ گھٹنا پاؤں ہیں.... آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا۔ اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا........ دم بھر کے بعد پھر بولا۔ کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آ جائیں تو شروع ہو وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے...........

وہ تو غزل پڑھ کاغذ پھینک سلام علیک کہہ کر چلے گئے مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا۔ اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا۔ (ماخوذ از آبِ حیات)

بسانِ نقش پائے رہرواں ۔ رستہ چلنے والوں کے پاؤں کے نشان کی مانند۔

افتادگی ۔ ماندگی۔ تھکاوٹ۔

نجیبوں کا ۔ بھلے لوگوں کا۔

ص ۴۲۔ وہیں۔ اسی وقت۔
لکۂ ہائے ابر۔ بادل کے ٹکڑے۔

کلام آتش

ص ۴۴۔ تقلید۔ پیروی کرنا۔ نقل کرنا۔
کبکِ دری۔ پہاڑی چکور۔ جو نہایت خوش رفتار ہوتا ہے
ص ۴۵۔ غائبانہ۔ غیر حاضری میں۔ پیٹھ پیچھے۔
زر بکف۔ ہتھیلی میں سونا لئے ہوئے۔
قارون۔ حضرت موسیٰ کا چچیرا بھائی۔ قارون دولت میں ضرب المثل ہے۔ اس کے چالیس خزانے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی بددعا سے قارون اپنے تمام خزانوں سمیت قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔
مہمیز۔ سواروں کی رکاب کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی میخ جس سے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہیں۔
تازیانہ۔ چابک۔
ص ۴۶۔ خمخانۂ افلاک۔ خم خانہ۔ مٹکے رکھنے کی جگہ۔ شراب خانہ + افلاک جمع فلک کی۔ آسمان۔
ص ۴۷۔ پیر مغاں۔ آتش پرستوں کا پیشوا۔ شراب فروش۔
ص ۴۸۔ عالم برگشتہ طالعی۔ طالع ستارہ + برگشتہ۔ الٹا ہونا +

بدقسمتی کی حالت۔

سکندر و دارا۔ سکندر یونان کا مشہور فاتح جس نے ایران کے شاہ دارا (دارایوش سوم) کو شکست دی تھی۔

ص ۴۹۔ **مسیحا**۔ دیکھئے صفحہ ۱۹۴۔

چہارم آسماں۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے انہیں زندہ ہی آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ اور ان کا مقام فلک چہارم ہے۔

سکندر اور آئینہ۔ آئینہ آئین اور ہ یا آہن اور ہ کا مرکب۔ آہن = لوہا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل سکندر نے لوہے سے آئینہ تیار کیا تھا۔

ص ۵۰۔ **یوسف**۔ حضرت یعقوب کے فرزند حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے ایک کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ جہاں سے ایک قافلے والوں نے انہیں نکالا اور اپنے ساتھ مصر لے گئے۔

کلامِ ذوق

ص ۵۲ **مسیحا**۔ دیکھئے صفحہ ۱۹۴۔

ص ۵۳ **نفس امّارہ**۔ خواہشوں کے حکم کرنے والا نفس۔ لذات دنیاوی کی خواہش۔

اکسیر - کیمیا۔ پارس۔ جو دھات کو سونے چاندی میں تبدیل کردے
ص ۵۴۔ قلقلِ مینا۔ مینا، صراحی، شراب کی بوتل + قلقل۔ صراحی
سے پانی یا شراب کے نکلنے کی آواز۔
شیطان۔ شیطان نے خدا کی نافرمانی کی اور حضرت آدم کو
سجدہ نہ کیا۔ اس وجہ سے معتوب ہوا۔
عنقا - ایک موہوم جانور۔
ص ۵۵۔ بطِ شراب۔ شراب کی صراحی۔
ایاغ - پیالہ۔ ساغر۔
مسیح و خضر۔ جنہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہے۔
ص ۵۶۔ وضو - اسلام کے قاعدہ کے مطابق نماز کے لئے جسم کے
خاص خاص مقامات کو دھونا۔
تیمّم - بجائے پانی کے مٹی سے وضو کرنا۔
یوسفِ کنعاں۔ حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف۔
کنعان کے رہنے والے۔ انہیں مصر میں لے جا کر بیچا گیا تھا
ص ۵۹۔ پیرِ خرابات۔ پیرِ مغاں۔ شراب فروش۔

کلامِ غالب

ص ۶۱۔ تشنۂ فریاد۔ آہ و زاری کا آرزومند
نیرنگِ نظر۔ نظر کا فریب۔
ص ۶۲۔ رضواں۔ ایک فرشتہ جو بہشت کا دربان ہے۔

ص ۶۴۔ قمار خانۂ عشق ۔ عشق ،محبّت + قمار خانہ ۔ جُوا کھیلنے کی جگہ ۔

مضمحل ۔ پریشاں ۔

نواسنجِ فغاں ۔ آہ و زاری کرنے والا ۔

ص ۶۷۔ ابنِ مریم ۔ حضرت عیسےٰ جو مریم کے بیٹے تھے ۔ آپ مریضوں کو صحت بخشا کرتے تھے ۔ اور مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے ۔

ص ۶۸۔ خضر و سکندر ۔ حضرت خضر سکندر کی رہنمائی کرتے ہُوئے اُسے چشمۂ حیات پر لے گئے ۔ جہاں انہوں نے خود تو پانی پی لیا لیکن سکندر نے جب وہاں پر دیکھا کہ کچھ ضعیف و نحیف آدمی آبِ حیات پینے کے باعث کہنے کو تو زندہ ہیں لیکن پڑے سِسک رہے ہیں تو بنا پانی پیئے ہی واپس آ گیا ۔

ص ۶۹۔ رشکِ سطحِ چرخِ مینائی ۔ نیلگوں آسماں کی سطح کو رشک دِلانے والی ۔

باد پیمائی ۔ ہوا خوری کرنا اور محاورہ میں کوئی بے فائدہ کام کرنا ۔

کلامِ حالی

ص ۷۲۔ کیمیا ۔ رانگ کو چاندی یا تانبے کو سونا بنانے کا عمل اکسیر

نفس کی تسخیر۔ اپنے آپ پر فتح پانا۔ من کو جیتنا
ظلِّ بالِ ہما۔ ہما کے پروں کا سایہ۔ ہما کے بارے میں مشہور ہے۔ کہ جس آدمی پر اس کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔

ص ۸۷۔ عنانِ فرس۔ گھوڑے کی لگام۔

کلامِ سرورؔ

ص ۸۳ بدّھیاں۔ بدّھی :۔ گلے کا ایک گہنا۔ پھولوں کا ہار۔

ص ۸۴ پدمنی۔ اس نظم کا موضوع "تاریخ ہند کی مشہور اور لافانی داستان ہے۔ پدمنی چتوڑ کے راجہ بھیم سنگھ کی رانی تھی۔ اُس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوکر دِلّی کے بادشاہ علاؤالدین نے چتوڑ گڑھ پر حملہ کیا۔ اور راجہ بھیم سنگھ کو دھوکے سے قید کر کے دِلّی لے گیا۔ رانی پدمنیؔ جیسا کہ مشہور ہے راجہ بھیم سنگھ کو قید سے چھڑا لائی۔ اب علاؤالدین نے دُوسری بار چڑھائی کی۔ اِس بھیانک لڑائی میں بہت سے راجپوت شُور ویر کام آئے۔ ادھر راجہ بھیم سنگھ نے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے اپنی جان دی۔ ادھر اُدھر رانی پدمنی نے بے شمار راجپوت دیویوں کے ساتھ

جوہر کی رسم ادا کر کے اپنے جسم خاکی کو نذر آتش
کر دیا۔

ص ۸۶۔ **منحلّا**۔ روشن۔

ص ۸۷۔ **تقدیس**۔ پاکیزگی۔

کلامِ اکبر الٰہ آبادی

ص ۹۲۔ **صانعِ عالم**۔ دُنیا کو بنانے والا۔

ص ۹۳۔ **عقبیٰ**۔ عاقبت۔ آخرت۔

کلامِ مہر

ص ۹۹۔ **سیماب**۔ پارہ

پندار۔ غرور۔ (ہندی۔ اہنکار)

روزِ حساب۔ قیامت کا دن جبکہ اسلام کے
عقیدہ کے مطابق سب انسانوں کو ان کے اعمال
کی سزا و جزا دی جائے گی۔

ص ۱۰۰۔ **بندِ علائق**۔ تعلقات۔ دُنیا کی محبّت کا بندھن۔

ص ۱۰۱۔ **کشفِ محجوب**۔ محجوب، جو پردہ میں ہو۔ کشف۔ پردہ
اُٹھانا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں وہ درجہ جہاں
غیب کے اسرار کھل جاتے ہیں۔

ص ۱۰۳۔ مادہ مینی۔ خودی و تکبّر۔

ص ۱۰۶۔ تناسخ۔ آواگمن۔ رُوح انسانی اپنے اعمال کے مطابق نیا جنم لیتی ہے۔

ذاتِ لایزالی۔ لازوال ہستی۔ خدا۔

ص ۱۰۷۔ حلول کرنا۔ دوسرے جسم میں داخل ہونا۔

ص ۱۰۹۔ ہمہ اوست۔ صوفیوں کا عقیدہ کہ سوائے خدا کے دُنیا میں اور کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

مجاز۔ برعکس حقیقت کے۔ روحانی کے مقابلے میں دُنیاوی۔

کلامِ چکبست

ص ۱۱۲۔ دردِ دل پاسِ وفا۔ یہ غزل ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی تھی۔

ص ۱۱۴۔ بدعت۔ مذہب میں نئی بات۔ اور نئی رسم شروع کرنا۔

ص ۱۱۵۔ مٹنے والوں کی وفا کا .... اس غزل کا سنِ تحریر ۱۹۱۷ عیسوی ہے۔

ص ۱۱۹۔ گوتم۔ بھگوان بدھ۔

سرمد۔ ایک خدا رسیدہ مجذوب۔

اکبر۔ مغلیہ خاندان کا بادشاہ اکبر۔

رانا۔ بھارت کا امر شور ویر مہارانا پرتاپ

ناقوس کی فغاں۔ سنکھ کی آواز۔

اذاں - نماز کے لئے بانگ۔

ص ۱۲۱۔ جوئے شیر۔ دُودھ کی نہر۔ فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیئے بیستون پہاڑ کو کھود کر دُودھ کی نہر نکالی تھی۔

کلامِ اقبال

ص ۱۲۳۔ غزنوی۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ غزنی کے بادشاہ محمود کو اپنے غلام ایاز سے عشق تھا۔

ص ۱۲۵۔ آفتاب۔ ویدوں کے مشہور منتر گایتری کا آزادانہ ترجمہ ہے

شیرازہ بند۔ یکجا کرنے والا۔

دفترِ کون و مکان۔ کائنات کی کتاب۔

عنصر۔ مٹی۔ ہوا۔ آگ۔ پانی۔

ص ۱۲۶۔ یزداں۔ ایران کے آتش پرست نیکی کے خالق کو یزدان اور بدی کے خالق کو اہرمن کہتے ہیں۔ یزدان۔ خدا۔ مالک۔

ساکنانِ نشیب و فراز۔ اونچی نیچی جگہوں پر رہنے والے کائنات کے سب ذی حیات۔

ص ۱۲۷۔ رام۔ مریادا پرشوتم بھگوان رام چندر۔

رامِ ہند۔ ہندوستان کے مطیع۔ مدّاح۔

فکرِ فلک رس۔ آسمان تک پہنچ جانے والا خیال۔

ص ۱۲۸۔ گورو نانک شری گورو نانک دیو جی مہاراج۔

ابراہیم و آذر حضرت ابراہیم خلیل اللہ۔ ایک پیغمبر۔ آذر

اُن کے والد یا چچا کا نام تھا۔

ص ۱۳۱۔ جہاں نما۔ جامِ جہاں نما۔ کیخسرو کا پیالہ۔ جس سے آیندہ کے حالات معلوم ہو جایا کرتے تھے۔

ص ۱۳۲۔ غربت۔ پردیس۔

کلامِ جوشؔ ملیح آبادی

ص ۱۳۶۔ شاہِ شہیداں۔ ہندوستان کے پیغمبرِ آزادی، راشٹر پتا مہاتما گاندھی + ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو پرارتھنا سبھا نئی دہلی میں آپ نے ناتھو رام گوڈسے نامی ایک جنونی کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔

ص ۱۳۷۔ نخچیرِ پیکانِ ستم۔ ظلم کے تیر کا شکار۔

صیادِ عنقائے مسرّت۔ خوشی کے عنقا کو شکار کرنے والا+ عنقا ایک فرضی پرندہ جو صرف نام ہی موجود ہے۔

دودِ چراغِ کشتۂ طاقِ حرم۔ حرم۔ کعبہ کی چاردیواری + طاق محراب۔ آلا + چراغِ کشتہ۔ بجھا ہوا چراغ + دود۔ دھواں۔

خاکسترِ پروانۂ بیت الصنم۔ بیت الصّنم۔ مندر + پروانہ۔ پتنگا + خاکستر۔ راکھ +

ص ۱۳۸۔ طبلِ وغا۔ وغا۔ جنگ۔ لڑائی + طبل۔ بڑا ڈھول۔ دمامہ +

کشتۂ خیر فراواں ۔ بہت زیادہ نیکی کرنے میں ہی اپنی جان دے دینے والا ۔

پائمالِ اہلِ عصیاں ۔ جسے گنہگاروں نے روند ڈالا ہو ۔

ص ۱۳۹ خداوندِ کشورِ جاں ۔ زندگی کی ولایت کا بادشاہ ۔

ص ۱۴۰ مُرغِ زیرِ دام ۔ جال میں آیا ہوا پرندہ ۔

سطوتِ افرنگ ۔ انگلستان کا دبدبہ ۔

لرزہ بر اندام ۔ جس کے جسم پر کپکپی طاری ہو ۔

گدائے خانہ براندازِ شاہاں ۔ بادشاہوں کے گھروں کو برباد کرنے والا گدا ۔

ص ۱۴۱ ۔ زمزم ۔ مکہ معظمہ کے پاس ایک کنواں جو کہ بہت متبرک تصور کیا جاتا ہے ۔

رودِ نیل ۔ دریائے نیل میں فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا تھا ۔

آتشِ نمرودِ عصرِ نو ۔ نئے دور کے نمرود کی آگ ۔ نمرود ایک بادشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ۔ اس نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تھا ۔ لیکن خدا کے حکم سے وہ آگ گلزار میں تبدیل ہو گئی تھی ۔

ص ۱۴۲ ۔ سرودِ رفتۂ بزمِ نشاطِ زندگی ۔ سرودِ رفتہ ، وہ لطف جو جا چکا ہو ۔ مٹ چکا ہو + بزمِ نشاطِ زندگی ۔ زندگی کی خوشی کی محفل +

شبِ مسروقۂ زلفِ درازِ دلبری ۔ شبِ مسروقہ ۔ وہ

رات جو چراغی جا چکی ہو۔ لُٹ چکی ہو۔ زلفِ
دراز دلبری۔ دلنوازی کی لمبی زلف۔

چراغِ مردہ محرابِ امن و آشتی۔ چراغِ مردہ۔ بجھا ہُوا
چراغ + محراب امن و آشتی۔ سکون و صلح کا
طاق +

متاعِ بُردہ۔ وہ سامان جسے لُوٹا جا چکا ہو۔

مہرِ مبیں۔ روشن سُورج۔

خاتم۔ انگوٹھی۔

سُلیماں۔ ایک بادشاہ۔ مشہور ہے کہ انسانوں کے علاوہ
جن پریاں اور دیو بھی ان کے ماتحت تھے۔

ص ۱۳۱ ۔ **جادۂ حق۔** حق۔ سچائی + جادہ۔ ڈگر۔ بٹیا۔ سچائی کا رستہ

حسینؓ ابن علیؓ۔ حضرت علیؓ کے فرزند امام حسینؓ جو کہ امیر
معاویہ کے بیٹے یزید کے ساتھ لڑ کر شہید ہوئے

صلیب۔ سُولی۔ حضرت عیسیٰ کے مخالفوں نے اُنہیں
سُولی پر لٹکا کر شہید کیا تھا۔

غلِ بے تیغ و سپاں۔ اشارہ اس حقیقت کی طرف کہ مہاتما
گاندھی اہنسا کے اوتار تھے۔

ص ۱۳۱ ۔ **شمر و یزید۔** شمر۔ یزید ابن معاویہ کا ایک فوجی افسر جس
نے امام حسینؓ کو شہید کیا تھا۔

خطیب۔ خطبہ پڑھنے والا۔ وعظ سنانے والا۔

سعیٔ نا مشکور۔ کامیاب نہ ہونے والی کوشش۔

ص ۱۴۵۔ کوثر و تسنیم ۔ بہشت کی نہروں کے نام۔
ص ۱۴۶۔ جلالِ قیصری ۔ شاہانہ شوکت۔
لیلائے حریت کے قیسِ عامری ۔ آزادی کی لیلیٰ کے مجنوں۔
محبوب آزادی سے محبت کرنے والے۔
حیوان دریدہ یوسفِ قدسی جمال ۔ پاکیزہ حسن رکھنے والے یوسف جسے کسی حیوان نے چیر پھاڑ دیا ہو+ حضرت یوسف حضرت یعقوب کے بیٹے تھے۔ اُن کے بھائیوں نے رشک کی وجہ سے انہیں ایک کنوئیں میں پھینک دیا۔ وہ اُن کا کرتہ پھاڑ کر حضرت یعقوب کے پاس لے آئے اور بولے کہ انہیں کسی درندہ نے پھاڑ دیا ہے۔ اس کنوئیں سے ایک قافلے والے حضرت یوسف کو نکال کر مصر لے گئے۔
خاور گزیدہ شبنمستاں ۔ شبنمستان۔ شبنم زار+ خاور گزیدہ جیسے سورج نے چن لیا ہو۔ سکھا دیا ہو+ اوس کی وہ بوندیں جنہیں سورج نے خشک کر دیا ہو۔

کلامِ محروم

ص ۱۴۹۔ ویدِ مقدس ۔ دنیا کی قدیم ترین الہامی کتاب ۔ وید چار ہیں رگ وید۔ یجر وید۔ سام وید اور اتھرو وید۔

ص ۱۵۱- سکوں پذیر نہ ہوا اضطراب استفہام - اضطراب استفہام - سوال کرنے کی پریشانی+سکوں پذیر نہ ہو - اطمینان نہ حاصل کرے - قرار نہ پائے+ شکوک دور نہ ہوں+

ص ۱۵۲ باغِ رضواں - بہشت کا باغ

ص ۱۵۳- ثریا - پروین - آسمان میں سات ستاروں کا ایک جھمکا

ماحیٔ ظلمتِ عصیاں - گناہوں کی تاریکی کو مٹانے والی -

ص ۱۵۴ پاک روحوں سے - اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ آغاز سے ہی بھارت ورش گے یوگی اور سادھو مہاتما گنگا کے کنارے "ادم" کا جاپ اور تپ کرتے رہے ہیں -

ناپائدار رشتے - سری محروم کی دھرم پتنی کا سورگباس عین جوانی کی عمر میں ہوا تھا - ان کے ماتم میں لکھی ہوئی محروم کی نظموں کا مجموعہ گنج معانی میں "طوفانِ غم" کے عنوان کے ماتحت دیا گیا ہے - یہ نظم ناپائدار رشتے اسی مجموعے میں سے لی گئی ہے -

ص ۱۵۵ پنبۂ غفلت بگوش - کانوں میں لاپروائی کی روئی ڈالے

ص ۱۵۶- شبِ دیجور - اندھیری رات -

ص ۱۵۷ کرمکِ شب تاب - رات کو چمکنے والا چھوٹا کیڑا جگنو

تعویذِ لحد - لوحِ مزار - قبر کا پتھر -

ص ۱۵۸- برُج - ستارے کا مقام - آسمان کے بارہ حصوں میں سے ایک +
شپّر - شب پرہ - چمگادڑ -

کلامِ جوشؔ ملسیانی

ص ۱۶۲ سامری فن - سامری حضرت مُوسیٰ کے زمانے کا ایک
مشہور جادُوگر - اِس نے سونے کا ایک بچھڑا
بنا کر بنی اسرائیل سے اس کی پُوجا کرائی تھی +
سامری جیسا ہُنر رکھنے والا -

ص ۱۶۴- کلغی والا - شری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج - دسویں بادشاہی
شرک دُوئی - خدا کی ذات میں کسی اور کو شریک سمجھنا -
زرِ قلب - کھوٹا سکّہ -

ص ۱۶۵ بسالت - دلیری -
روباہ - لومڑی -
شیرِ ژیاں - غضبناک شیر -

ص ۱۶۶ شطرنج پیادہ - مشہور کھیل شطرنج میں پیادے کا مُہرہ
صرف آگے کی طرف چال چل سکتا ہے - پیچھے
نہیں جا سکتا -

کلامِ فراقؔ

ص ۱۷۴ پسماندگاں - پسماندہ کی جمع - جو لوگ پیچھے رہ گئے ہوں -

مرگِ ناگہاں ۔ اچانک واقع ہونے والی موت ۔

کلامِ عرش ملسیانی

ص ۱۸۲ ۔ مطمحِ وفا ۔ وفا کا مقصود ۔

ص ۱۸۳ متلون مزاج ۔ جس کی طبیعت مختلف رنگ بدلے ۔

کلامِ آزاد

ص ۱۸۹ ۔ تکلم ۔ گویائی ۔

ارتقا ۔ بتدریج ترقی ۔